جلد ۹۸ ستمبر ۱۹۸۲ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ہماری نئی مطبوعات

مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن
کا اسپیشل سیٹ اور ترجمہ قرآن مجید کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے
اس کے علاوہ ادارہ ترجمان القرآن کی نئی کتابیں

- ○ مولانا مودودی کے سیاسی افکار — از عبدالکریم عابد
- ○ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ — از سید ابوالاعلیٰ مودودی
- ○ سفینہ نجات — از جمیل احسن ندوی
- ○ تحریک اسلامی کے مراحل — از سید اسعد گیلانی

طبع ہو کر جلد آنے والی ہیں

پہلی بار تفہیم القرآن آفسٹ کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے
خوبصورت لیدر بائنڈنگ اور خوشنما چھپائی۔

اس کے لیے اپنا آرڈر بک کرائیں:

ادارہ ترجمان القرآن 5-A ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

اعراض ۱۶۶ موچند بلڈنگ ، انارکلی ، لاہور

مکتبہ ترجمان القرآن ۴۰ - اردو بازار لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۸ | ستمبر ۱۹۸۲ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ | عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ———— ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کچھ ایسی سرکش قوتیں زمین پر ہمیشہ موجود رہی ہیں، جن کو نہ خدا کا خوف ہوتا ہے، نہ خلق کی شرم، نہ انسانی حقوق کا پاس، نہ اخلاقی قدروں کا لحاظ اور نہ عہد و پیمان کی پروا۔ یہ قوتیں ہر دور میں چھوٹے اور بڑے فساد کا سبب بنتی ہیں۔ زندگی میں تمام بگاڑ ان کی وجہ سے ہوتا ہے، اور یہی امن و سلامتی کی دھجیاں بکھیرتی ہیں۔ یہ بیماری اگر محض چند افراد تک محدود ہو تو وہ معاشرے میں جرائم کا طوفان اُٹھاتے رہتے ہیں اور اس کا اثر اگر کسی قوم اور اس کے حکمرانوں تک جا پہنچے تو پھر وہ دوسری قوموں اور حکومتوں کے لیے عذاب بن جاتے ہیں۔ آج کی دُنیا ایسی ہی سرکش اور بے اُصول اور قوت پرست طاقتوں کے گھیرے میں ہے جن کی وجہ سے زمین کے چپے چپے پر فساد ہے۔

قرونِ وسطیٰ تو کیا، قرونِ مظلمہ میں بھی فاسد طاغوتی قوتوں نے ظلم و جبر کے جو بدترین وحشیانہ طریقے نکالے تھے، اب معاملہ ان سے ہزار گنا آگے نکل گیا ہے۔ افغانستان میں رُوسی فوج کے ہاتھوں جس طرح گاؤں کے گاؤں ملیا میٹ کیے جا رہے ہیں اور زہریلی گیسوں کے بگولے مجاہدین کے ساتھ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو اپنی مہلک لپیٹ میں لے رہے ہیں ــــــ یا ادھر دوسری جانب امریکہ کی پشت پناہی سے اسرائیل نے جنگ کے تمام مروّجہ قوانین اور متفقہ حدود کو بر طرف رکھ کر فلسطینیوں پر جو بہیمانہ مظالم ڈھائے ہیں، جس بے محابا طریق سے کئی کئی گھنٹوں تک ٹنوں وزنی بم برسائے ہیں۔ فاسفورس کے شعلہ پاش بموں سے جس بڑی تعداد میں مردوں کے علاوہ عفت مآب خواتین اور معصوم بچوں کو جھلسایا ہے، جس

بے باکی سے پناہ گزینوں کے کیمپوں اور ہسپتالوں کو تباہی کا نشانہ بنایا ہے اور جس غیر انسانی جذبے سے بجلی، پانی، خوراک اور دواؤں کی رسد سے فلسطینی پناہ گزینوں اور زخمیوں اور بوڑھوں، بچوں کو محروم کیے رکھا ہے، ان سارے احوال کو دیکھ کر انسانیت کی ابتدائی لازمی قدروں کا دیوالیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔

تباہی اور سنگ دلی کا یہ نیا دَور مرہونِ منت ہے اُن سائنسی انکشافات اور ٹیکنالوجیکل ترقیات کا جن کو فلاح و تعمیر اور امن و سلامتی کی راہ پر ڈالنے والے تمام نظریات و اعتقادات کو جدید نظریۂ ارتقا نگل چکا ہے۔ اس باطل نظریے سے یہ اخلاقی اصول وضع کر لیا گیا ہے کہ جس کے پاس قوت ہو، وہی برسرِ حق ہے اور جو دوسروں کے خلاف اپنی قوت کو زیادہ سے زیادہ بے رحمی سے استعمال کر سکے وہی زندہ رہنے کا مستحق ہے۔

تو اب ہم ایک شدید ترین دَورِ فساد کے سامنے کھڑے ہیں، جس کی سب سے زیادہ زد ہمیں پر پڑ رہی ہے۔ کتنے ہی خطوں اور ملکوں میں مسلمان دونوں سپر پاورز اور اُن کی پروردہ اور حمایت یافتہ قوتوں کے ناوکہائے ستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یہ ہم سے ابلیس کا انتقام ہے، اس قصور پر کہ ہم نے کیوں خدائے واحد سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے لیے دامنِ مصطفیٰ کو تھاما ہے۔ زمین پر اس قیامت آفریں فساد کے سیلِ آتشیں کی لہریں کبھی ایک علاقے میں سر ابھارتی ہیں اور کبھی دوسرے میں، اور ہر ایسی لہر کی لپیٹ میں ملّتِ اسلامیہ ہی کا کوئی نہ کوئی حصہ آتا ہے۔ ساتھ ہی سارے عالمِ انسانی کا امن تباہ ہو جاتا ہے۔

فساد کسی بھی درجے کا ہو اور کسی بھی زمانے میں ہو، اس کا علاج اسلام نے جہاد قرار دیا ہے۔ جہاد نہ صرف مسلمان اُمت کے اپنے تحفظ و بقا کا ضامن ہے، بلکہ پوری انسانیت کی خیر و فلاح جہاد ہی میں مضمر ہے۔ ہمارا جہاد جو جہاد فی سبیل اللہ کہلاتا ہے، اس کی غایت ہی یہ ہے کہ قوت کو حق ماننے والے لوگ حق کو قوت تسلیم کریں، ساری نوعِ انسانی کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور کوئی سلطنت یا سپر پاور کسی کو کمزور پا کر اُسے بموں اور گیسوں سے تباہ نہ کر سکے۔

ہم اپنے اس فریضہ کو بھول چکے ہیں۔ افراد میں اس جذبے کا کارفرما ہونا تو کجا، دنیائے اسلام کی اکثر حکومتوں کے سامنے بھی کوئی ایسا منصوبہ نہیں کہ وہ اس دور کی قوتوں کے مقابلے میں اس دور کے احوال وضروریات کے مطابق کھڑی ہو سکیں۔ روایتی طور پہ کچھ نفری سپاہ کی ہو گی، اُن کے پاس گزارے کے کچھ سازوسامان ہوں گے۔ اور پیشِ نظر صرف یہ ہوگا کہ اگر جنگ کی بلا سر پہ آ ہی پڑے تو کچھ نہ کچھ کیا جا سکے۔ مگر نہ قوموں کی سطح پہ اور نہ بین الاسلامی سطح پر کوئی بڑا منصوبہ موجود ہے کہ ہمیں آج کی کسی حریف قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے کس درجہ کی فوجی تنظیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ فوجی اغراض سے کیا ہمارے پاس ریسرچ اور تجربات کے لیے سائنسی سنٹر موجود ہیں؟ کیا اعلیٰ درجے کے ہماری اسلحہ کی تیاری کا انتظام ہے؟ کیا ایسی متفقہ اسٹراٹیجی متعین ہے کہ کس جگہ سے کہاں وار کیا جا سکتا ہے اور کونسا راستہ تحفظ کا راستہ ہے۔ ہمارا معاملہ تو معمولی سفارتی اور پروپیگنڈائی سطح پر بھی دوسروں سے کمزور ہے۔ ہمارے پاس اعلیٰ درجے کے ماہر ڈپلومیٹ نہیں ہیں۔ ہمارے سفیر اُن لہروں اور رَوؤں کی کاٹ نہیں کر سکتے، جو رُوس اور امریکہ اور دوسرے بڑے بڑے عالمی مراکز یا دشمن ممالک سے اُٹھتی ہیں۔

پس جہاد کے لیے تیاریٔ جہاد ضروری ہے۔

یہاں میں قرآن کریم کی صرف ایک مختصر آیتِ جہاد کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ سورۂ صف میں ارشادِ ربانی ہے کہ:۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔ (ترجمہ) "یقیناً اللہ اُن لوگوں کو چاہتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر جنگ کریں"۔ اِس آیت میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں؛ جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے یا اُن سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جنگ کریں۔

دوسری بات یہ کہ جنگ اللہ کی راہ میں ہونی چاہیے۔

تیسری بات یہ کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والوں کو بنیان مرصوص بن کر معرکہ آرا ہونا چاہیے۔

اللہ اُن لوگوں کو چاہتا ہے یا پسند کرتا ہے یا اُن سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جنگ کریں، اس سے از خود یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دین میں جہاد افضل ترین عبادت ہے۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ۔ "ذُروۃ سنامہ جہاد"

اسی بنا پر حضورؐ نے فرمایا:۔

"جو شخص اس حالت میں مرا کہ نہ اُس نے جہاد کیا اور نہ جہاد کا ارادہ کیا، وہ ایک طرح کی حالتِ نفاق میں مرا۔" (روایت حضرت ابوہریرہ۔ مسلم۔ مسند احمد)

"جس نے نہ جہاد کیا، نہ مجاہد کو سامان مہیا کیا اور نہ مجاہد کے اہل و عیال کی دیکھ بھال نیک نیتی سے کی، وہ قیامت کے روز شدید آفت سے دوچار ہوگا۔" (روایت حضرت ابوامامہ۔ ابوداؤد)

دین کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ابتدا ہی سے ایک جہاد ہے۔ جس دن کوئی شخص کلمہ کو قبول کرتا ہے۔ اُس دن غیر اللہ کی مختلف الٰہیتوں کے خلاف اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے۔ طاغوت اپنا نفس ہو، یا اپنا خاندان، یا برادری، یا حکومت یا رسم و رواج یا کوئی باطل نظریہ اور کوئی فاسد تحریک —— "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کہتے ہی اس سے جنگ کا آغاز ہو گیا۔

ایک داعیٔ حق کا حق کے لیے قوت جمع کرنا، تیاریٔ جہاد ہے اور اس لیے جہاد کے حکم میں داخل ہے۔

بخلاف اس کے اگر کوئی شخص اسلامی عقیدے ذہن میں رکھ کر یا کچھ عبادات و اخلاق کی پابندی کرتے ہوئے طاغوتی قوتوں اور باطل نظریات کے ساتھ صلح سلامتی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے

تو وہ جہاد کی پہلی ہی منزل میں جہاد کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔

جہاد کا آخری مرحلہ (قتال) آنے سے پہلے دل سے اور زبان سے اور دماغ سے اور قلم سے اور اپنے کردار سے اور اپنے مال سے ان مزاحم قوتوں کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے جو دین کا راستہ روکیں۔

پس جس طرح یہ بات برحق ہے کہ مومن کی ساری زندگی خدا کی عبادت پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست ہے کہ ایمان والوں کی ساری زندگی جہاد کی زندگی ہونی چاہیے۔ اگر ایک درجے کا جہاد ہو رہا ہو تو یہ کوشش کہ اس سے اگلے درجے کا جہاد ہو سکے، وہ درجہ حاصل ہو جائے تو پھر یہ اہتمام کہ اس سے بھی اگلے مرحلۂ جہاد میں قدم رکھا جا سکے۔

آیت متذکرۃ الصدر کا دوسرا تقاضا ہے " فی سبیلہ " یعنی جہاد وہ مطلوب ہے جو صرف اللہ کی راہ میں کیا جائے۔

جہاد فی سبیل اللہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جہاد سے اللہ کی رضا و خوشنودی اور اس کی تعمیلِ حکم کے سوا کچھ مطلوب نہ ہو۔ کوئی دنیوی فائدہ یا اپنی ذات کے لیے اقتدار حاصل کرنا نصب العین نہ ہو۔ خاندانی، طبقاتی، لسانی اور علاقائی عصبیتیں اس کی محرک نہ ہوں۔ اسی طرح اس میں شہرت طلبی اور ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔ مجاہد فی سبیل اللہ کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں لڑوں گا تو لوگ مجھے بہادر قرار دیں گے یا دُور دُور تک میرے کارناموں کا شہرہ ہو جائے گا۔ اسی طرح مالِ غنیمت کے حصول کا لالچ بھی نیّت میں شامل نہ ہونا چاہیے۔ جہاد کے پردے میں آدمی کسی سے ذاتی انتقام لینے کا خیال نہ کرے۔ کسی غلط قوت کا آلۂ کار بن کر لڑنا بھی ایک مسلمان کے لیے درست نہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جہاد سے اُن عقائد و مقاصد اور اصول و ضوابط کا غلبہ مطلوب ہونا چاہیے جن کے مجموعے کا نام دین ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں۔ یعنی حقیقی مقصد یہ ہو کہ یکون الدین کلہ للہ۔

جہاد فی سبیل اللہ کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ اس کے دوران میں مجاہد اُن حدود و ضوابط کی پابندی کرے جو جہاد و قتال کے لیے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں۔ نظم و ترتیب کا اہتمام، بے رحمی اور ناشائستگی سے پرہیز، مالِ غنیمت کے بارے میں ضابطے کی شدید پابندی، دشمن کے لیے صلح کی راہ کھلی رکھنا، غیر مصافی لوگوں کو ہدف بنانے سے پرہیز کرنا۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک وغیرہ اُمور کی پابندی جہاد کرنے والوں پر لازم ہے۔
جس کسی نے "فی سبیلہٖ" کے ان تقاضوں سے روگردانی کر لی وہ بڑی سعادت سے محروم ہوا۔

لفظ "صَفًّا" نہ صرف صف بندی کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ اس میں ضبط و نظم کا پورا مفہوم بھی شامل ہے۔ عملاً تو میدانِ جنگ میں بکثرت ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ سیدھی صفیں قائم نہیں رہتیں۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ نظم اور ڈسپلن کا کڑا اہتمام کیا جائے۔ یونہی ہڑبونگ نہ مچی ہوئی ہو کہ جس کا جدھر منہ اُٹھے اُدھر کو لپکتا جائے۔ اور دوسروں کی اُسے کچھ خبر نہ ہو اور نہ کسی سے تعلق ہو۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ سارا کام ایک کمانڈ کے تحت ہونا چاہیے۔ یوں بھی یہ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہوسکتی۔
مگر لفظ صف کے ساتھ جو تعریفی کلمہ آیا ہے اُس کے کچھ مزید تقاضے ہیں۔ فرمایا: "کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ" صف ایک ایسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ہو جس میں کہیں کوئی رخنہ نہ پایا جائے۔ صف بنانا نسبتاً آسان ہے، "بنیان مرصوص" بننا مشکل ہے۔
بنیان مرصوص تب بنتی ہے جب دلوں سے دل ملے ہوئے ہوں۔ محض کندھوں سے کندھا یا ٹخنے سے ٹخنہ ملانے سے یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔ دلوں کا ملنا اس پر منحصر ہے کہ سارے مسلمان ایک ہی دین پر جمع ہوں، اُن کے سامنے ایک ہی نصب العین ——— اقامت دین ——— ہو۔ وہ آپس میں نرم خو ہوں (رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ) ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہوں۔ ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتے ہوں۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہوں، ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں، دلوں میں بغض نہ رکھیں، کسی کے سینے میں "غِلّ" نہ موجود رہے، کوئی دوسرے کی

غیبت نہ کرے، کسی کو بر سرِ مجلس رسوا نہ کیا جائے، وہ سلام اور دعوتوں اور ہدیوں اور مشوروں اور ملاقاتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے وابستہ رہیں۔

یہ پیغام معمولی درجے کے اتحاد سے برتر ہے، مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ایک ہی دین کے ماننے والوں میں ملکوں کے اندر بھی اور بین الاسلامی سطح پر بھی حقیقی اتحاد تک موجود نہیں ہے۔ نظریاتی تصادم ہیں، طبقاتی جھگڑے ہیں، فرقہ وارانہ مناظرے ہیں، خاندانوں میں رقابتیں ہیں، علاقوں اور نسلوں میں کھچاؤ ہے ـــــ اور دشمن قوتیں ہمارے اس افتراق کو بڑھانے کے درپے ہیں۔

کیا عبرت ناک منظر ہے کہ مسلم دشمن قوتیں ہماری دشمنی میں متحد ہیں۔ اُن میں سے کوئی کبھی مشکل وقت میں ہمارے کام نہیں آیا۔ بلکہ ہر کسی نے مشکل مرحلوں میں ہمیں ظلم اور اذیت اور سازش کا نشانہ بنایا۔ دشمنوں کے اس اتحاد کے مقابلے میں بربنائے ضرورت بھی ہم متحد نہیں ہو سکے۔

ہمارے ملکوں کے اندر بھی اوّل تو حکمرانوں اور عوام میں فاصلے ہیں۔ پھر عوام کو پھاڑنے والی قوتیں خود ہمارے اندر بھی موجود ہیں۔ اور باہر کی قوتیں بھی اپنا ہاتھ دکھاتی رہتی ہیں، بلکہ ستم یہ ہے کہ باہر کی قوتیں ہمارے ہی اندر سے آلۂ کار حاصل کر لیتی ہیں۔

خصوصیت سے ہمارے معاشرے لادینیت پسند اور داعیانِ اسلام کے اندر اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان میں برسوں سے محاذ آرائی چل رہی ہے۔ داعیانِ اسلام چاہتے ہیں کہ معاشرہ اسلام کی راہ پر پیش قدمی کرے۔ اور حکومت اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرے، مگر لادینیت پسند ایک ایک معاملے میں دانتوں اور ناخنوں کا زور لگا دیتے ہیں کہ ایسی کوئی اصلاح نہ ہونے دیں گے جو معاشرے کو اسلام کی طرف پیش قدمی میں مدد دے۔

پھر ہمارے معاشروں میں رشوت و خیانت اور فحاشی و عیاشی کے طوفان اُٹھ رہے ہیں جن کی وجہ سے فرد فرد یا تو اپنی حیثیت بنانے اور اس سے لطف لینے میں مصروف ہے، یا اپنے آپ کو لٹنے اور پسنے سے بچانے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کو تھامنے اور سہارا دینے کی اسپرٹ دولت پرستی اور عیش پرستی کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ غائب ہو رہی ہے۔

ایسے میں اتحاد کا خواب برسوں سے پریشان ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ اتحاد کو آہستہ آہستہ اس درجے تک پہنچا دیا جائے کہ مسلمان اور مسلمان کے (باقی بر صفحہ ۵۲)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

(ادارہ)

غور کرو کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اتنی فضیلت اور تعریف کس لیے ہے؟ جہاد کرنے والوں کو بار بار کیوں کہا جاتا ہے کہ وہی کامیاب ہیں اور انہی کا درجہ بلند ہے؟ — اور اس سے بچ کر گھر بیٹھنے والوں کو ایسی تنبیہیں کیوں کی جاتی ہیں؟ اس سوال کو حل کرنے کے لیے ذرا اُن آیات پر پھر ایک نظر ڈال جاؤ جن میں جہاد کا حکم اور اُس کی فضیلت اور اُس سے بھاگنے کی بُرائی لکھی ہے۔ اِن آیات میں کامیابی اور عظمت کے معنی کسی جگہ مال و دولت اور ملک و سلطنت کا حصول نہیں بتائے گئے۔ جس طرح کرشن جی نے ارجن سے کہا تھا کہ اگر تو اس جنگ (مہابھارت) میں کامیاب ہوا تو "دُنیا کے راج کو بھوگے گا" (گیتا ۲: ۳۷)، اس طرح قرآن میں کہیں یہ کہہ کر قتال فی سبیل اللہ کی جانب رغبت نہیں دلائی گئی کہ اس کے عوض تمہیں دولت اور حکومت ملے گی۔ بلکہ اس کے برعکس ہر جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے عوض صرف خدا کی خوشنودی اور صرف اللہ کے ہاں بڑا درجہ ملنے اور عذابِ الیم سے محفوظ رہنے کی توقع دلائی گئی ہے۔ سقایۃ حاج اور عمارۃ مسجدِ حرام سے، جو عرب میں بڑے رسوخ و اثر اور بڑی آمدنی کا ذریعہ تھا، گھر بار چھوڑ کر نکل جانے اور جہاد فی سبیل اللہ کرنے کو افضل بتایا۔ اور پھر اس کے عوض اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے نزدیک بڑے درجے) کے سوا اور کسی انعام کا ذکر نہیں کیا۔ دوسری جگہ ایک تجارت کا گُر سکھایا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید یہاں کچھ دھن دولت کا ذکر ہو۔ مگر پڑھ کر دیکھیے تو اس تجارت کی حقیقت یہ نکلتی ہے کہ اللہ کی

راہ میں جان اور مال کھپاؤ، اور اس کے عوض عذاب سے نجات حاصل کرو۔ ایک اور جگہ لڑائی سے جی چرانے والوں کو اس بات پر ڈانٹا جا رہا ہے کہ وہ بیوی بچوں کی محبت میں گرفتار پائے جاتے ہیں اور اپنے کمائے ہوئے مال اور اپنی تجارت کے کساد اور اپنے محبوب مکانوں کے چھٹنے کا خوف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ دُنیا میں جنگ کر کے جو لوگ مُلک فتح کرتے ہیں، انہیں روپیہ بھی خوب ملتا ہے، اُن کی تجارت بھی خوب چمکتی ہے اور انہیں مفتوح قوم سے چھینی ہوئی عالی شان عمارتیں بھی رہنے کو ملتی ہیں۔

پھر جب اس جہاد سے دُنیا کی دولت اور ملک گیری مقصود نہیں ہے تو آخر اس خون ریزی سے اللہ کو کیا ملتا ہے کہ وہ اس کے عوض اتنے بڑے بڑے درجے دے رہا ہے؟ آخر اس پُرخطر کام میں کیا رکھا ہے کہ اس کی بھاگ دوڑ سے گرد آلود ہونے والے قدموں تک کو الطاف و عنایات کا مورد بنایا جاتا ہے؟ اور آخر اس میں وہ کونسی کامیابی مُضمَر ہے کہ اس خشک و بےمزہ جنگ میں لڑنے والوں کو بار بار اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کہا جا رہا ہے؟ اس کا جواب اسی لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ اور اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ میں پوشیدہ ہے۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا جائے۔ اُسے یہ گوارا نہیں ہے کہ اس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ و برباد کیا جائے۔ اُسے یہ پسند نہیں ہے کہ طاقتور کمزوروں کو کھا جائیں، اُن کے امن و چین پر ڈاکے ڈالیں، اور ان کی اخلاقی، روحانی اور مادی زندگی کو ہلاکت میں مبتلا کریں۔ اُسے یہ منظور نہیں ہے کہ دُنیا میں سیہ کاری، بداعمالی، ظلم و بے انصافی اور قتل و غارت گری قائم رہے۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ جو خاص اس کے بندے ہیں، ان کو مخلوق کا بندہ بنا کر ان کی انسانی شرافت پر ذلت کا داغ لگایا جائے۔ پس جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش، بغیر کسی دھن دولت کے لالچ، بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنّا کے محض خدا کی خاطر دُنیا کو اس فتنہ سے پاک کرنے کے لیے اور اس ظلم کو دُور کر کے اس کی جگہ عدل قائم کرنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال، اپنی تجارت کے فوائد، اپنے بال بچوں اور باپ بھائیوں کی محبت اور اپنے گھر بار کے عیش و آرام، سب کو قربان کر دے، اس سے

زیادہ اللہ کی محبت اور اللہ کی رضامندی کا مستحق کون ہوسکتا ہے؟ اور فلاح و کامرانی کی آغوش اس کے سوا اور کس کے لیے کھل سکتی ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ کی یہی فضیلت ہے جس کی بنا پر اُسے تمام انسانی اعمال میں ایمان باللہ کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہی چیز تمام فضائل و مکارمِ اخلاق کی روح ہے۔ انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں برداشت نہ کرے اور اُسے دفع کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائے۔ انسانی شرافت کی سب سے اعلیٰ اسپرٹ ہے اور عملی زندگی کی کامیابی کا راز بھی اسی اسپرٹ ہی میں مضمر ہے۔ جو شخص دوسروں کے لیے بدی کو برداشت کرتا ہے اس کی اخلاقی کمزوری اسے بالآخر اس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنے لیے بدی کو برداشت کرنے لگے۔ اور جب اُس میں برداشت کا یہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس پر ذلت کا وہ درجہ آتا ہے جسے خدا نے اپنے غضب سے تعبیر کیا ہے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ اِس درجہ میں پہنچ کر آدمی کے اندر شرافت و انسانیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔ وہ جسمانی و مادّی غلامی ہی نہیں بلکہ ذہنی و رُوحانی غلامی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور کمینگی کے ایسے گڑھے میں گرتا ہے جہاں سے اُس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس شخص میں یہ اخلاقی قوت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث بُرا سمجھے اور انسانی برادری کو اس سے نجات دلانے کے لیے انتھک جدوجہد کرتا رہے۔ وہ ایک سچا اور اعلیٰ درجے کا انسان ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود عالمِ انسانی کے لیے رحمت ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو چاہے دُنیا سے کسی معاوضہ کی خواہش نہ ہو۔ مگر دُنیا ان تمام ناشکریوں کے باوجود جن کے داغ اس کی پیشانی پر موجود ہیں، اتنی احسان ناشناس نہیں ہے کہ وہ اس خادمِ انسانیت کو اپنا سرتاج، اپنا امام اور اپنا سردار تسلیم نہ کرلے، جو بے لاگ، بے اُمیدِ اجر، بے تمنائے مزد اُسے بدی کے تسلّط سے چھڑانے اور اخلاقی و روحانی اور مادّی آزادی عطا کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اسی سے اس آیت کے معنی سمجھ میں آتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ زمین

کے وارث میرے نیکوکار بندے ہوں گے۔ اور یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۔ اس سے آخرت ہی کی کامیابی مراد نہیں ہے، بلکہ دُنیا کی کامیابی بھی حقیقۃً انہی لوگوں کے لیے ہے جو نفسانی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے بندوں کی بھلائی کے لیے جہاد کرتے ہیں۔

جہاد کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ قوموں کی زندگی میں اس کو کیا درجہ حاصل ہے اور نظامِ تمدّن کو درست رکھنے کے لیے اس کی کس قدر ضرورت ہے۔ اگر دُنیا میں کوئی ایسی قوت موجود ہو جو بدی کے خلاف پیہم جہاد کرتی رہے اور تمام سرکش قوتوں کو اپنی اپنی حدود کی پابندی پر مجبور کر دے تو نظامِ تمدّن میں بے اعتدالی ہرگز نظر نہ آئے کہ آج سارا عالمِ انسانی ظالموں اور مظلوموں، آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا ہے، اور تمام دُنیا کی اخلاقی و روحانی زندگی کہیں غلامی و مظلومی کے باعث اور کہیں غلام سازی و جفاکیشی کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ بدی کو دوسروں سے دفع کرنا تو ایک بڑا درجہ ہے، اگر اُسے خود اپنے سے دفع کرنے کا احساس بھی ایک قوم میں موجود ہو اور اس کے مقابلہ میں وہ اپنے عیش و آرام کو، اپنی دولت و ثروت کو، اپنی نفسانی لذات اور اپنی جان کی محبت کو، غرض کسی چیز کو بھی عزیز نہ رکھے تو وہ کبھی ذلیل و خوار ہو کر نہیں رہ سکتی اور اس کی عزت کو کوئی قوت پامال نہیں کرسکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف قوم کا خاصّہ ہونا چاہیے اور اگر وہ اعلائے حق اور اعانتِ حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اُسے کم از کم تحفظِ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہیے جو شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجے سے گر کر جو قوم اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر بڑھ جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اُسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کر لے تو ایسی قوم کے لیے دُنیا میں کوئی عزت نہیں ہے، اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔

اسی رمز کو سمجھانے کے لیے خدا نے بار بار اپنی حکیمانہ کتاب میں ان قوموں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے بدی کے خلاف جہاد کرنے میں جان و مال اور لذاتِ نفسانی کا ٹوٹا دیکھ کر اس سے جی چرایا اور بدی کا تسلط قبول کر کے اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے خسران و نامرادی کا داغ لگا لیا۔ ایسی قوموں کو خدا ظالم قومیں کہتا ہے۔ یعنی انھوں نے اپنے اعمال سے خود اپنے اُوپر ظلم کیا، اور حقیقتہً وہ اپنے ہی ظلم سے تباہ ہوئیں۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں ہوں۔ اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

ہماری نئی مطبوعات

۱۔ فقہ الزکاۃ۔ یوسف القرضاوی۔ حصہ اول دوم مجلد ۵۰/- روپے
۲۔ فقہ الزکاۃ۔ یوسف القرضاوی۔ حصہ سوم ۳۰/- ″
۳۔ سید بادشاہ کا قافلہ۔ آباد شاہ پوری ۴۸/- ″

البدر پبلی کیشنز۔ اُردو بازار۔ لاہور

عقلِ وجدانی کی نارسائی

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عقلِ وجدانی حقیقتِ کبریٰ تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ یہ بات طے کرنا ضروری ہے کہ کیا عقلِ وجدانی بھی عقلِ استدلالی کی طرح خود مکتفی ہے۔ اور حقیقت رس ہے۔ اس سوال کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ مذاہب عالم کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس غلط فہمی نے بہت بڑا بگاڑ پیدا کیا ہے۔ اور یہ بگاڑ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔

بلاشبہ یہ بات درست کہ حاسۂ مذہبی انسان کی فطرت میں ودیعت کردہ ایک جذبہ ہے، اور یہ اس جذبہ کی اثر آفرینی ہے کہ انسان حق کا متلاشی ہوتا ہے۔ یہ بات حق ہے، لیکن حاسہ، جذبہ یا طلب کا موجود ہونا اور بات ہے، اور محض اس کے بل پر منزلِ مقصود اور منزلِ مراد تک پہنچ جانا اور بات ہے۔ اس موقعہ پر عقلِ تجزیاتی سے استدلال کرنا بھی درست نہیں ہے۔ یہ گمان کرنا درست نہیں ہے کہ جس طرح "علم الاسماء" کی تخم ریزی سے عقلِ تجزیاتی اور عقلِ استدلالی نے اس قدر ترقی کر لی اور مادّی دنیا کی تسخیر میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی، اسی طرح "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کی تخم ریزی سے عقلِ وجدانی بھی ترقی کرے اور حقیقتِ کبریٰ تک رسائی حاصل کرے اور عرفان حاصل کرے۔ بات یہ ہے کہ عقلِ استدلالی کے لیے روزِ ازل ہی میدان مفتوح کر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ "زمین اور آسمان کی ساری چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے"۔ (جاثیہ - ۱۳) - یہ آیت عقلِ استدلالی کی فتوحات

کے لیے منشورِ الٰہی کا حکم رکھتی ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ بالقوۃ تمام اشیاء کو انسانوں کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اب ان کو بالفعل تسخیر کرنا باقی ہے۔ یہ کام عقلِ انسانی مشیتِ ایزدی کے تحت ایک خاص نہج اور تدریج کے ساتھ مسلسل کرتی رہتی ہے۔

مگر عقلِ وجدانی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی منشور نہیں دیا ہے، بلکہ اس کے برعکس عقلِ وجدانی کی محدودیت کا کھلے الفاظ میں اعلان فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"روح عالمِ امر سے متعلق ہے اور اس کا علم تم کو بہت کم دیا گیا ہے"۔
(بنی اسرائیل - ۸۵)

اِس آیت نے بات صاف کر دی ہے۔ عقلِ استدلالی ہو یا عقلِ وجدانی دونوں کی رسائی عالمِ روحانیت میں بہت کم ہے۔ کشف ہو یا اشراق، حقیقتِ کبریٰ تک اُن کی رسائی نہیں ہے۔ حقیقتِ کبریٰ لامتناہی ہے اور مطلق ہے۔ انسان مقید ہے، فانی ہے۔ اور اُس کی عقل تجزیاتی ہے۔ مقید کیسے مطلق کو اپنے احاطۂ علم میں لا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"اس کے (اللہ کے) علم کو انسان اپنے احاطۂ علم میں نہیں لا سکتا۔ مگر یہ کہ خود اللہ تعالیٰ ہی اپنا فضل فرما دے"۔ (بقرہ - ۲۵۵)

نہ پہنچی وہاں تک خرد کی کمند
بہت اُونچی ہے ان کی بامِ بلند

جس قدر علمِ غیب کی ضرورت انسان کو اپنی دُنیاوی زندگی بحسن و خوبی بسر کرنے کے لیے ہے، اس کو ایک دوسرے طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کر دیا ہے۔ وہ علم انبیاء کرام کے ذریعے وحیِ الٰہی کی صورت میں انسانوں کو دے دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "وہ (اللہ) غیب کا عالم ہے۔ وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا، مگر رسولوں میں سے جس کو وہ پسند کر لیتا ہے (اس پر ظاہر کر دیتا ہے)"۔ (جن - ۲۶ - ۲۷)۔ دُنیا میں نزولِ آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے آدم کو بتا دیا تھا کہ بے شک انسانوں کو راہ ہدایت دکھانا ہماری ذمہ داری ہے"۔ (لیل - ۱۲)
دوسری جگہ زیادہ وضاحت سے فرمایا۔ "میرے پاس سے جو کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے (بذریعہ رسول) پھر جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کے لیے کسی قسم کے رنج اور خوف

کا موقع نہیں ہے۔ (البقرہ - ۳۸) - ان آیاتِ مبارکہ نے کسی شک و التباس کے بغیر یہ بات واضح کر دی ہے کہ عرفانِ حقیقت کا جس قدر علم دینی اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے، اُس قدر علم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے مختلف زمانوں اور مختلف مکانوں میں نوعِ انسانی کو مہیا فرما دیا ہے تاکہ کسی دَور کے انسان کو گمراہی میں بھٹکنے کا عذر باقی نہ رہے۔ اس علم کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے ہوتا ہے "کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا، بلکہ اس کلمہ سے زندہ رہتا ہے جو خداوند کریم سے اس کو ملتا ہے۔" اب انسانوں کی سعادت اس میں ہے کہ وہ نبیوں اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات کو مضبوطی سے تھام لیں۔ اس پر کاربند رہیں۔ اس میں کمی بیشی نہ کریں۔ انسان کی عقلِ وجدانی کو انبیاء کرام کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی سرگرمی جاری رکھنا چاہیے اور کسی صورت میں اس سے بے نیازی اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

بعض حکما اور مذہبی پیشواؤں نے وحیِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر عقلِ استدلالی یا عقلِ وجدانی کے بل پر روحانیت کا سفر اختیار کیا، اُن سب نے ٹھوکریں کھائیں۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسری مخلوقِ خدا کو بھی گمراہی کی راہوں میں دھکیل دیا۔ یہ بات عمرانیات کے ہر طالب پر واضح ہے کہ عقلِ استدلالی صدیوں تک اوہام و خرافات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھری ہے اور یہ کہ عقلِ وجدانی نے ہر شجر اور حجر کو الوہیت کے استھان پر بٹھا کر صدیوں اس کی پرستش کی ہے۔ اس کے سامنے جبہ سائی کی ہے۔ شرک و بت پرستی کی وہ کون سی قسم ہے جو کسی نہ کسی انسانی معاشرہ نے اختیار نہ کی ہو اور اس طرح اشرف المخلوقات، خلیفۃ اللہ فی الارض حضرت انسان کی تحقیر اور تذلیل نہ کی ہو۔

عرفانِ حقیقت کا صحیح صحیح ادراک کر لینا تو بہت بڑی بات ہے، انبیاء کرام کی بتائی ہوئی حقیقتوں کو صحیح طور پر سمجھ لینا، اور راہ ہدایت پر راست روی کے ساتھ چلنا بھی عقلِ انسانی کے لیے دشوار گزار مرحلہ رہا ہے۔ جب کہیں اور جہاں کہیں عقلِ انسانی کو آزاد روی کا موقع ملا ہے تو راہِ مستقیم پر چلنے کے بجائے عموماً وہ پگڈنڈیوں میں گھس جاتی ہے۔ راہ گذر میں چلتے چلتے وہ راہ حق سے دُور بھٹک جاتی ہے۔ جب بھی عقل کا دستِ تصرف دراز ہوا، اس نے حک و اضافہ

کمی وبیشی کی جدت طرازیوں کی، نیرنگی اور بوقلمونی کا وہ چمن آراستہ کیا کہ مردِ حقیقت شناس اس جعلی چمنستان کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اِن دست درازیوں نے انبیاء کرام کی تعلیمات کی صورت مسخ کر دی، حلیہ بگاڑ ڈالا، حتیٰ کہ محققین و راسخین کو خرافات کے اس مجموعے میں سے اصل حقیقت کا سراغ لگانا دشوار ہو گیا۔ مقصود کی وضاحت کے لیے ذیل میں چند مثالیں پیش کرنا بے محل نہیں ہو گا۔

ہندوستان کے مذہبی رہنماؤں (رشی منی) نے تعلیم دی تھی کہ عبادتِ الٰہی کے لیے ضروری ہے کہ دل خدا کی طرف متوجہ ہو[1]۔ اور یک سو ہو۔ یہ بات صحیح ہے۔ اس پر ہندوستان کے حکماء نے مزید اضافہ کیا کہ بے چون وچگون خدا وند تعالیٰ کا ذہن میں تصور کر نا کر لینا عوام الناس کے لیے سخت دشوار ہے، اس لیے کہ:

ع "خوگرِ پیکر محسوس ہے انساں کی نظر"

اب دل کو متوجہ کرنے کے لیے اور نگاہوں کو مرتکز کرنے کے لیے یہ تجویز مناسب ہے کہ ظاہری مادّی پیکر کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ حکماء نے یہ اجازت دے دی۔ بس پھر کیا تھا، ہندوؤں نے شجر وحجر کی وہ پرستش کی کہ الامان والحفیظ۔ بدھ مت کے ابتدائی دور میں مہاتما بدھ کا دانت یا ہڈی یا بال نگاہوں کا ہدف ہوتا تھا۔ اس پر توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے یونانیوں نے سکندر کے اخلاف نے بُت تراشی کا فن ہندوستان میں رائج کیا۔ جب انہوں نے بدھ مذہب قبول کر لیا تو بُدھ کی مجسمہ سازی کی۔ اور بڑے اعلیٰ پیمانے پر کی۔ ہندوستان اور سارے وسط ایشیا کو بُدھ کے مجسموں سے بھر دیا۔ فارسی لفظ "بُت" "بدھ" سے ماخوذ ہے۔

بُت پرستی کی یہی وہ توجیہہ ہے جو غزنوی دور میں ابو ریحان البیرونی نے بیان کی ہے، پھر اکبری دور میں علامہ ابو الفضل نے بیان کی ہے اور زمانۂ حال کے ہندو فلسفی رادھا کرشنن نے بیان کی ہے۔ اگر یہ توجیہہ درست ہے تو غور کیجیے کہ آغاز کیا تھا اور انجام کہاں پہنچا۔ عقلِ

[1] حضور اکرمؐ کی بھی حدیث ہے کہ حضورِ قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی، مگر اسلام نے اس معیار کو اعلیٰ مطلوب تو ضرور قرار دیا ہے، فرض قرار نہیں دیا۔

استدلالی نے کیا گل کھلائے ہیں۔

بُدھ مت کے رہنماؤں نے تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرنا ضروری ہے[1]۔ یہ بات حق ہے۔ بُدھ مذہب کے حکماء نے ذکر کرنے کی عملی شکل یہ اختیار کی کہ تسّو دانوں کی ایک مالی تیار کی۔ تسبیح کی ایجاد بدھوں ہی کے ہاتھوں ہندوستان میں عمل میں آئی ہے۔ دوسرے مذاہب والوں نے تسبیح بدھوں سے اخذ کی ہے۔ فتح ایران و افغانستان اور سندھ کے بعد تیسری صدی ہجری میں تسبیح کا رواج عالمِ اسلام میں ہوا ہے۔ صلیبی جنگوں میں مسیحی راہنماؤں نے مسلمانوں سے تسبیح کا طریقہ اختیار کر کے سارے یورپ میں پھیلا دیا۔ بُدھ حکماء نے ذکر کرنے کے طریقے میں پھر مزید جدت اور اختراع سے کام لیا۔ انھوں نے ایک پہیہ یا چرخی بنائی جس پر تسّو چھوٹے چھوٹے تختے لگا دیے اور ہر تختے پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھ دیا۔ جب پہیہ ایک چکر گھوم جاتا تو گویا تسّو دانوں کی تسبیح پوری پڑھی جاتی۔ اور ذکر کا وظیفہ پورا ہو جاتا۔ پھر مزید اختصار سے کام لیا گیا اور اس کے لیے چھوٹی چھوٹی چرخیاں بنائی گئیں۔ اشتراکی انقلاب سے قبل تبت میں مذہبی لوگوں کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی چرخیاں ہوتی تھیں۔ جن کو وہ ہر وقت گھماتے رہتے تھے، بات چیت بھی کرتے رہتے تھے اور ذکر اللہ بھی جاری رہتا تھا۔ اب ذرا سوچیے، دل کی توجہ سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم کہاں اور مشینی انداز میں چرخی گھمانا کہاں۔ عقلِ استدلالی نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔

مذکورہ بالا مثالیں عبادات کے باب میں عقلِ استدلالی کی دخل اندازیوں کی تھیں۔ عقائد کے باب میں گمراہی کی واضح مثال کُردوں کا یزیدی فرقہ ہے۔ عراق اور ایران میں جب آلِ بویہ کو اقتدار حاصل ہو گیا تو پھر ان علاقوں میں شیعیت کو فروغ حاصل ہو گیا۔ شیعوں کے نزدیک یزید بن معاویہ مبغوض ترین اور کافر ترین فرد تھا۔ اس غلو اور تشدد کے خلاف عدی بن مسافر نے وعظ و تبلیغ کی۔ انھوں نے غلو سے روکا اور راہِ اعتدال اختیار کرنے کی تلقین کی۔ وہ شیخ عبدالقادر جیلانی

[1] ذکر کا حکم قرآن میں بھی دیا گیا ہے۔ " یہ اللہ کا ذکر ہے جس سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے"۔

رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ عالم باعمل اور متقی انسان تھے۔ (منہاج السنۃ۔ امام ابن تیمیہؒ) بعد میں آنے والوں نے اس پر اضافے کیے۔ پہلے اعتدال پسندی کو پسندیدگی میں تبدیل کر دیا۔ پھر پسندیدگی نے محبوبیت اور مطلوبیت کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور آج گردوں کا یزیدی فرقہ یزید کی پرستش کرتا ہے۔ عقلِ استدلالی کو دراندازی کا موقع ملا تو اس نے یہ کرشمہ سازیاں دکھائیں۔ مسخ اور انحراف کی ایسی کتنی صورتیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں رائج ہیں، جنہوں نے تقدس کا چولا پہن رکھا ہے۔ حالانکہ وہ سب گمراہی کی مختلف صورتیں ہیں جو دینِ مبین کے اندر بدعتوں نے داخل کر دی ہیں۔

عرفانِ حقیقت کی راہ میں عقلِ وجدانی کی گمراہیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ادعا خواہ کچھ بھی ہو، حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کبریٰ کے انکشاف اور ادراک کے لیے کشف واشراق بھی کوئی مستند ذریعہ نہیں ہے۔ کشف واشراق کی غلط بینی اور غلط کاری سے تصوف کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس راہ سے بہت سی گمراہیوں نے جنم پایا ہے جو آج ہمارے معاشرے میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ توضیح مقاصد کے لیے یہاں دو ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک بہت بڑے صوفی شیخ اکبر نے فتوحاتِ مکیہ میں اپنے مکاشفات درج کیے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ حالت کشف میں انہوں نے عقولِ عشرہ (TEN CATAGORIES OF LOGIC) سے ملاقات کی ہے۔ واضح رہے کہ عقولِ عشرہ منطق کی اصطلاح ہے جو اہلِ یونان کی اختراع کردہ ہے۔ کم، کیف، متی، اَین وغیرہ منطقیوں کی اصطلاح میں عقولِ عشرہ کہلاتی ہے، جن سے مفہوم اور منطوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ نہ یہ کوئی ذی روح ہستی ہے، نہ ان کا مرئی وجود ہے، جن سے ملاقات ہو سکے۔

قدیم بابلی اور یہودی روایات میں زہرہ ایک عورت تھی جو آسمان پر چلی گئی اور وہاں زہرہ ستارہ بن گئی۔ ایک کشف میں شیخ اکبر نے زہرہ سے ملاقات کی ہے بلکہ مقاربت کی ہے۔ حالانکہ آج یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زہرہ بھی ایک ایسا ہی سیارہ ہے جیسا کہ زمین ہے یا جیسا کہ مریخ ہے۔ وہ کوئی عورت نہیں ہے۔ ان مکاشفات سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ کشف واشراق میں بھی ماحول کی روایات عکس ریز ہوتی ہیں۔ مکاشفہ میں انسان اپنے فکری ماحول

اور مبلغِ علم کے دائرہ ہی میں پرواز کرتا ہے۔ بہرحال کشف واشراق عرفانِ حقیقت کا کوئی مستند ذریعہ علم نہیں ہے۔

یہی باعث ہے کہ پاک وہندوستان کے جلیل القدر شیخ طریقت حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے "برکشف کفش باید زد" (مکتوبات)۔ یعنی کشف پر جوتا مارنا چاہیے۔ اس کو رد کر دینا چاہیے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی کشف کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ (مرج البحرین)۔ حق بات یہ ہے کہ عرفانِ حقیقت اور تقرب الٰہی کا سفر صرف وحی الٰہی کی رہنمائی میں اور صرف انبیاء کرام کی رہبری میں طے ہو سکتا ہے۔ دوسرا ہر طریقہ گمراہی پر منتج ہوتا ہے ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

ورنہ جہاں کہیں موقع ملتا ہے آرزو عقلِ استدلالی کے نام سے تخیل آرائی کی بزم آراستہ کر لیتی ہے۔ ع

ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

ان گمراہیوں کی تاریخ سامنے ہو تو شارع اسلام کا یہ فیصلہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ عقائد کے لیے اور عبادات کے لیے نص صریح (صاف حکم) از قرآن وسنت درکار ہے۔ استنباط، استدلال اور قیاس کی عقائد اور عبادات کے باب میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں تو صرف ایک ہی اصل اصول ہے کہ جو کچھ شارع علیہ السلام سے منقول ہے بس وہ حق ہے۔ اپنی طرف سے کمی بیشی یا اضافہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ انسان کی عملی زندگی میں تغیر وتبدل واقع ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے وہاں قیاس اور استنباط کی ضرورت ہے۔ عقائد اور عبادات کے طریقے دائمی ہیں۔ وہاں تغیر راہ نہیں پاسکتا۔ وہاں قیاس آرائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

علامہ عینی صاحبِ عمدۃ القاری

(۷۶۲ھ تا ۸۵۵ھ)

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

صحیح بخاری کے شارحین میں ہر مذہب و مسلک کے ائمہ و فضلا شامل ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ شہرت حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی (م ۸۵۲ھ) اور علامہ عینی (م ۸۵۵ھ) کو حاصل ہوئی۔

نام و نسب محمود نام، ابو محمد کنیت اور بدر الدین لقب تھا۔

ولادت ۲۶ رمضان المبارک ۷۶۲ھ کو عین میں پیدا ہوئے۔ اور اسی نسبت سے عینی کہلائے [1]

ابتدائی تعلیم ہوش سنبھالا تو سب سے پہلے عام دستور کے مطابق قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آپ کے والد ماجد عین تاب میں منصب قضا پر فائز تھے۔ اپنے والد ماجد کے علاوہ علامہ عینی نے شمس الدین محمد الراعی اور ابن صالح بغدادی

---

[1] اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۲۵۵۔ شہر عین تاب ایک خوبصورت اور بڑا شہر ہے۔ جہاں چٹانوں کے درمیان بنا ہوا ایک مستحکم قلعہ بھی ہے۔ یہ شہر باغات اور نہروں سے معمور ہے۔ یہاں بڑے بڑے بازار ہیں۔ یہ شہر حلب سے شمالی سمت تین مراحل پر واقع ہے۔

(تقویم البلدان۔ ص ۲۶۹)

سے بھی تحصیل علم کی[1] صرف، نحو، منطق و اصول، معانی و بیان کی کتابیں شیخ میکائیل حسام الرہادی اور ابن محمود السرادی سے پڑھیں[2]۔

تحصیلِ علم کے لیے سفر عین تاب میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد تحصیلِ علم کے لیے دوسرے ملکوں کا سفر کیا۔ اور جن شہروں میں آپ تحصیلِ علم کے لیے تشریف لے گئے، اُن میں حلب، کفتا اور ملیلہ شامل ہیں۔ ان شہروں میں آپ نے جن اساتذہ و شیوخ سے تعلیم حاصل کی اُن کے نام یہ ہیں علامہ جمال الدین علی، شیخ حیدر الرومی، شیخ ولی البھنسی، شیخ علاؤ الدین اور شیخ بدر الکشانی[3]۔

تحصیلِ علم کے دوران ہی علامہ عینی کے والد ماجد کا ۷۸۴ھ میں انتقال ہوگیا۔ مگر آپ نے تعلیم جاری رکھی۔

حصولِ تعلیم کے بعد تکمیلِ تعلیم کے بعد سب سے پہلے علامہ عینی حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور حج بیت اللہ کے بعد بیت المقدس تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات مصر کے مشہور عالم علامہ سیرامی سے ہوئی۔

مصر میں قیام بیت المقدس میں آپ کی ملاقات علامہ سیرامی سے ہوئی اور بہت مجلسیں ہوئیں۔ علامہ سیرامی بہت بڑے عالم، حافظ، محدث، مؤرخ، مفسر اور جامع معقول و منقول تھے۔ علامہ عینی اُن کے تبحر علم سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ آپ نے علامہ سیرامی کا مستقل قرب اختیار کر لیا۔ چنانچہ ۷۸۸ھ میں آپ علامہ سیرامی کے ساتھ قاہرہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں آپ کو تدریس کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ اور مصر میں آپ کا قیام علامہ سیرامی کی وفات (۷۹۰ھ) تک رہا۔

درس و افادہ قیامِ مصر کے دوران آپ نے حدیث و فقہ کا درس دیا اور آپ سے دور دراز

---

[1] الضوء اللامع جلد ۱۰ ص ۱۳۱

[2] البدر الطالع جلد ۲ ص ۲۹۴

[3] البدر الطالع جلد ۲ ص ۲۹۴

ممالک کے تشنگانِ علم آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔ امام شوکانی (۱۲۵۰ھ) لکھتے ہیں:

استقر بالقاہرۃ ودرس فی مواطن منہا [1]

"وہ قاہرہ میں سکونت پذیر ہو گئے اور وہاں مختلف مقامات پر درس دیا"

آپ کے تلامذہ میں مختلف مسالک کے ائمہ شامل ہیں، جیسا کہ حافظ سخاوی نے لکھا ہے:

واخذ عنہ الائمۃ من کل مذہب طبقۃ بعد اخری بل اخذ منہ اہل الطبقۃ الثالثۃ وکنت ممن قرأ علیہ اشیاء [2]

"علامہ عینی سے یکے بعد دیگرے ہر مذہب کے ائمہ نے فیض حاصل کیا۔ بلکہ اُن سے طبقہ ثالثہ کے شیوخ نے بھی کسب فیض کیا۔ اور میں نے بھی ان سے کچھ چیزیں پڑھی ہیں۔"

امام شوکانی بھی علامہ سخاوی کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

واخذ عنہ الطلبۃ من کل مذہب [3]

آپ سے ہر مذہب کے لوگوں نے استفادہ کیا۔

قیام مصر کے دوران میں آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس کا نام "بدریہ" تھا۔ اس زمانہ میں آپ کے تبحر علمی کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ اور ہر سمت سے طالبانِ علم کا ہجوم استفادہ کے لیے اُمنڈ پڑا، جیسا کہ ابن عماد حنبلیؒ لکھتے ہیں:

اشتہر اسمہ وبعد صیتہ وافتی ودرس حتی انہ صار من اعیان الفقہاء الحنفیۃ [4] اُن کا نام مشہور ہو گیا، اور

---

[1] البدر الطالع جلد ۲ ص ۲۹۴

[2] الضوء اللامع جلد ۱ ص ۱۳۳

[3] البدر الطالع جلد ۲ ص ۲۹۴

[4] شذرات جلد ۷ ص ۲۸۷

دُور دُور تک اس کی شہرت پہنچ گئی۔ انہوں نے درس و افتا کی ایسی خدمات انجام دیں کہ وہ کبار فقہائے احناف میں شمار کیے جانے لگے۔

تبحر علمی اور جامعیت آپ کو جملہ فنون میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ علمائے وقت نے آپ کے تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔

امام ابن تغری بردی (م ۸۷۴ھ) جو کہ آپ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں، لکھتے ہیں کہ:

"علامہ عینی متعدد علوم میں ماہر تھے۔ وہ ایک متقن تھے اور فقہ واصول، نحو، صرف اور لغت کے فاضل تھے۔ ان کے علاوہ اور علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ بالخصوص تاریخ میں اعجوبہ روزگار تھے۔ معقولات و منقولات میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا علم ہوگا جس میں وہ پوری مہارت نہ رکھتے ہوں"[1]

حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ:

"وہ امام، عالم اور عربیت کے ماہر تھے۔ تاریخ اور لغت کے حافظ اور بہت سے فنون کے جامع تھے۔ نظم و نثر دونوں میں ان کا مقام بہت بلند تھا"[2]

مولانا عبدالحی لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں۔

"عینی کو تخریج احادیث اور اُن کے معانی کی وضاحت میں کامل عبور حاصل تھا اور وہ تمام علوم پر وسیع نظر رکھتے تھے"[3]

دوسرے کمالات علامہ عینی میں علمی کمالات کے ساتھ ساتھ اور بھی کمالات تھے۔ خوشنویس بھی تھے، عربی کے علاوہ ترکی زبان پر پورا عبور تھا۔ جیسا کہ عماد حنبلی نے لکھا ہے کہ:

"علامہ عینی عربی اور ترکی دونوں زبانوں میں ماہر اور فصیح اللسان تھے"[4]

---

[1] اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۲۵۸
[2] الضوء اللامع جلد ۱۰ ص ۱۳۳
[3] الفوائد البہیہ ص ۸۶
[4] معجم المطبوعات جلد ۲ ص ۱۴۰۳۰

چنانچہ آپ اپنی عربی تاریخ بادشاہ وقت ملک اشرف کو ترکی میں ترجمہ و تفسیر کر کے سنایا کرتے تھے۔ اور ملک اشرف آپ کا بہت قدردان تھا۔ اور آپ کی قرأت کو بہت پسند کرتا تھا[1]

امراء سے تعلقات علامہ عینیؒ کے امرائے وقت اور اعیانِ سلطنت سے اچھے تعلقات تھے۔ گو اس دور کے اربابِ دعوت و عزیمت اور علماء و فضلاء کی ایک بڑی جماعت نے اعیانِ حکومت اور اصحابِ دول سے بے تعلقی اور بے اعتنائی کی ایسی شاندار مثالیں قائم کی ہیں جو ہر زمانہ میں دلیلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ لیکن عینی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے قصرِ دربار میں رہ کر نہ صرف اپنے دامن کو تر ہونے سے محفوظ رکھا، بلکہ ان اعیانِ حکومت کی اصلاح کی بھی کامیاب کوششیں کیں۔ اس لیے عینی کا امراء سے تقرّب بھی درحقیقت دین کے لیے تھا۔ چنانچہ ملک اشرف کو جو آپ سے خصوصی تعلق رکھتا تھا، دین کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ خود ملک اشرف کو اس کا اعتراف تھا وہ کہتا تھا کہ " اگر عینی نہ ہوتے تو ہم مسلمان نہ ہوتے "[2]

اور آپ کے تلمیذ رشید ابن تغری بردی لکھتے ہیں کہ:

"ملک اشرف علامہ عینی سے دینی امور اور عبادات وغیرہ کے سلسلہ میں جو سوالات کرتا تھا۔ علامہ عینی اس کو اس سہولت سے جواب دیتے جو اس کی سمجھ میں آسانی سے آجاتے وہ ان سے انتہائی حُسنِ سلوک کرتا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے بعض وقت اشرف کو کہتے ہوئے خود سنا ہے کہ اگر علامہ عینی نہ ہوتے تو ہم پورے مسلمان نہ ہوتے"۔[3]

اس بیان سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ آپ کے شاہانِ وقت سے تعلقات دینی فوائد کے پیش نظر تھے۔ اور حقیقت میں عینی کی ذات "جام شریعت" اور "سندان عشق" کی جامع تھی۔

---

[1] معجم المطبوعات جلد ۲ ص ۱۴۰۳۰

[2] الضوء اللامع جلد ۱۰ ص ۱۳۲

[3] اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۲۵۷

منصب قضا اور دوسرے مناصب امراء اور سلاطینِ وقت سے تعلق کی بنا پر علامہ عینی مختلف اوقات میں مختلف منصبوں پر مامور ہوئے۔ چنانچہ ملک اشرف کے زمانہ میں قضا کے علاوہ محکمہ احتساب اور جیل کے نگران بھی آپ تھے۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ "عینی سے پہلے قضا، احتساب اور جیل کی نگرانی کے عہدے بیک وقت کسی ایک شخص میں جمع نہ ہوئے۔"[۱]

وفات نصف صدی سے زیادہ علم و عمل اور فہم و دانش کے چراغ روشن کرکے اور اس کے ساتھ تمام عہدوں سے علیحدگی اختیار کرکے خلوت گزیں ہو گئے۔ اور تصنیف و تالیف کا شغلہ اختیار کیا اور یہ زمانہ آپ کا بڑی تنگ دستی میں گذرا اور آخری عمر میں جائداد اور کتابیں فروخت کرنے کی نوبت آگئی۔

حافظ سخاوی کا بیان ہے:-

"اور وہ اپنی موت تک برابر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ مگر جیلوں کی نگرانی سے علیحدگی کے بعد املاک اور کتابوں کی فروخت کرنے کی نوبت آگئی۔ صرف وہ کتابیں محفوظ رہیں جو انہوں نے مدرسہ کے لیے وقف کی تھیں۔ یہ بھی بڑی تعداد میں تھیں۔"[۲]

اسی حالت میں ۴ ذی الحجہ ۸۵۵ھ کو علم و عمل کا یہ خورشید درخشاں پوری صدی سے زائد تک دنیائے علم پر ضیا پاشی کرنے کے بعد غروب ہو گیا۔[۳]

دوسرے دن نماز جنازہ ادا کی گئی اور قاہرہ میں آپ کے مدرسہ میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ صاحب المنہل رقمطراز ہیں کہ "ان کے جنازہ میں بڑا اژدحام تھا۔ اور عوام نے ان کی رحلت

۱۔ الضوء اللامع جلد ۱۰ ص ۱۳۳

۲۔ حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۲۱۰ - البدر الطالع جلد ۲ ص ۲۹۵

۳۔ اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۲۵۸

کا بڑا غم منایا"۔[۱] اور حافظ سخاوی لکھتے ہیں:۔

"عینی کی رحلت کا بڑا غم منایا گیا۔ کیونکہ ان کے بعد آن جیسی جامع شخصیت نہیں پیدا ہوئی"۔[۲]

تصنیفات علامہ عینی نے ہر فن میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کثرتِ تصانیف میں ان کی نظیر معاصرین میں حافظ ابن حجر کے علاوہ شاذ و نادر ہی مل سکتی ہے۔ مگر ان کی تصانیف کو ان کی زندگی میں اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی، اس لیے نسبتاً کم ہی ان کی کتابوں کے نام ملتے ہیں۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں:۔

"عینی نے بکثرت کتابیں تصنیف کیں۔ حتیٰ کہ اپنے شیخ (حافظ ابن حجر) کے بعد مجھے کثرت تصانیف میں کسی نظیر کا علم نہیں"۔[۳]

علامہ شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) لکھتے ہیں:۔

"تصانیفہ کثیرۃ جداً"[۴]

امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں،

"لہ مصنفات کثیرۃ"[۵]

تاہم ان کی مشہور تصانیف کا تعارف ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ عمدۃ القاری جیسا کہ شروع مضمون میں مَیں نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری کے شارحین میں ہر مسلک کے ائمہ و فضلا شامل ہیں۔ سب سے زیادہ شہرت حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی صاحب

[۱] اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۲۵۸
[۲] الضوء اللامع جلد ۱۰ ص ۱۳۳
[۳] الضوء اللامع جلد ۱۰ ص ۱۳۳
[۴] البدر الطالع جلد ۲ ص ۲۹۴
[۵] بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ ص ۳۸۶

فتح الباری اور علامہ بدرالدین عینی حنفی کو حاصل ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ حافظ صاحب کی فتح الباری ان کی زندگی ہی میں قبولیت کے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ لیکن علامہ عینی کی عمدۃ القاری بھی اپنی گوناگوں فنی و علمی خوبیوں کی بنا پر صحیح بخاری کی دیگر تمام شروح کے مقابلہ میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور بدرالدین بخاری کی جتنی بھی شروح لکھی گئی ہیں۔ وہ سب درحقیقت بنیادی طور پر ان ہی دونوں شرحوں کے محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔

علامہ عینی کو اس معرکۃ الآرا تصنیف سے بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ اگر عینی اس کتاب کے علاوہ اور کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو یہی ایک کتاب ان کے علو مرتبت اور علمی جلالت کے لیے کافی ہوتی۔ علامہ عینی نے یہ شرح ۸۲۱ھ میں لکھنی شروع کی اور ۸۴۷ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی[1]

عمدۃ القاری کی خصوصیات حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنے مسلک میں تشدد کی بنا پر حنفیہ پر جابجا تعصبات و اعتراضات کیے ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی معاصر اہلِ علم حنفیہ کی جانب سے ان کا دفاع کرے۔ چنانچہ علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں حافظ ابن حجر کے تمام اعتراضات کے جوابات دیے اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب عمدۃ القاری حافظ ابن حجر کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اس کے مطالعہ کے بعد حنفیہ پر کیے گئے بہت سے تعقبات سے رجوع کرکے اس کی اصلاح کرلی تھی اور جن مسائل میں اپنی رائے پر قائم رہے، ان کے رد میں انتقاض الاعتراض کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی جو نامکمل رہ گئی۔

علامہ عینی نے اپنی شرح میں فتح الباری سے خاصا استفادہ کیا ہے، بلکہ حافظ سخاویؒ کے بیان کے مطابق بعض جگہ پورے پورے صفحات نقل کردیے ہیں۔

ایک موازنہ عمدۃ القاری اپنی بعض خصوصیات میں حافظ ابن حجر کی فتح الباری سے ممتاز ہے۔ حافظ ابن حجر نے بعض ضروری چیزیں اپنی شرح میں چھوڑ دی تھیں۔ علامہ عینی نے ان تمام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے اس شرح کی وقعت و افادیت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ (باقی)

---

[1] سیرۃ البخاری ص ۲۱۸۔

"اجماع" بحیثیتِ ماخذِ فقہِ اسلامی

شفقت حسین خادم ایم۔اے۔ شعبۂ علومِ اسلامی یونیورسٹی آف کراچی

(۲)

اجماع کی قطعیت یا ظنیت اجماع قطعی حجت ہے یا ظنی؟ اس میں علمائے اُصول کا اختلاف ہے۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل چار اقوال ملتے ہیں:

۱۔ قطعی حجت ہے۔ اصفہانی نے اس قول کو اکثر کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ مشہور یہی ہے۔ (ارشاد ص ۸۷)۔

۲۔ ظنی حجت ہے۔ ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام رازی اور آمدی اس کے قائل ہیں۔ (ارشاد ص ۷۹)

۳۔ اجماع کو معتبر سمجھنے والے جس اجماع کی حجت پر متفق ہیں۔ یعنی (اجماع نصاً) وہ قطعی ہے اور جس میں مختلف ہیں مثلاً اجماع سکوتی یا وہ اجماع جس کا مخالف نادر ہو وہ اجماع ظنی ہے۔ (ارشاد ص ۷۹)

۴۔ امام بزدوی اور احناف کی ایک جماعت صحابہ کے اجماع کو کتاب یا خبرِ متواترہ کی طرح صحابؓ کے سوا دوسروں کے اجماع کو خبرِ مشہور کی طرح اور اس اجماع کو جس میں عصرِ سابق میں اختلاف ہو چکا ہو خبرِ واحد کی طرح مانتے ہیں۔ گویا ان حضرات کے نزدیک پہلی صورت میں اجماع قطعی ہے، باقی دونوں صورتوں میں ظنی اور دوسری صورت میں اس کی ظنیت نسبتاً قوی ہے۔

حُجیّتِ اجماع کے دلائل علمائے اُصول نے اجماع کے حجت ہونے پر منقول و معقول ہر قسم

کے دلائل پیش کیے ہیں۔ منقول دلائل میں کتاب اللہ کی آیات ہیں اور احادیث رسول ﷺ بھی۔ کتاب اللہ کی جن آیات سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱ــــ " وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۔ (نساء - ۱۱۵) ترجمہ:- جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے درآں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا۔ اور اسے جہنم میں جھونکیں گے۔ جو بدترین جائے قرار ہے۔

(تفہیم القرآن - جلد ۱ ص ۳۹۶ - ۳۹۷ - از مودودیؒ)

امام شافعیؒ سے جب ایک بزرگ نے حجتِ اجماع کی قرآنی دلیل پوچھی تو وہ تین روز تک گھر میں معتکف رہے اور ہر روز تین مرتبہ اوّل سے آخر تک قرآن کی تلاوت کی تب جا کر ان کی سمجھ میں یہ دلیل آئی:-

۲ــــ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (نساء - ۵۹)

ترجمہ:- اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل ص ۳۶۳ - از مولانا مودودی)

۳ــــ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ - ۱۴۳) ترجمہ:- اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔ (معارف القرآن جلد اوّل ص ۳۶۵ - از حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ)۔

۴ــــ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۔ (آلِ عمران - ۱۰۳)

ترجمہ:- اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو (تدبر القرآن۔ جلد اوّل ص ۷۵۲ - از امین احسن اصلاحی)۔

۵۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران ۔ ۱۱۰) ترجمہ:۔ تم بہترین امت ہو لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو (تدبر القرآن جلد اول ص ۶۵، از امین احسن اصلاحی)۔

۶۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (توبہ ۔ ۱۱۹) ترجمہ:۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو (فقہ میں اجماع کا مقام ص ۱۵ ۔ از رفیع عثمانی)

عام طور پر کتب اصول میں یہی چھ آیات ملتی ہیں جن سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چھٹی آیت کا ذکر کشف بزدوی جلد ۳ ص ۲۵۷ میں ہے اور پہلے کی پانچ آیات کا ذکر آمدی نے جلد ۱ ص ۱۰۳ ۔ ۱۱۱ میں کیا ہے اور بعض حضرات مثلاً سرخسی، صدر الشریعہ، امیر کاتب اتقانی نے ان کے علاوہ بعض دوسری آیات سے بھی استدلال کیا ہے۔

حدیث سے دلائل اجماع کے حجت ہونے پر جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے وہ اتنی کثیر ہیں جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ احادیث مشہور ہیں اور کسی نے ان کا انکار نہیں کیا۔ (آمدی جلد اول ص ۱۱۲، بزدوی جلد سوم ص ۲۵۸)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں اجماع کی حقانیت کو اور زیادہ صراحت و تاکید سے بیان فرمایا اور اس ضمن میں روایت کردہ احادیث کا مجموعہ حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔ فقہاء و محدثین نے جن احادیث سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے، اُن میں سے جو احادیث احقر کو سرسری تلاش سے دستیاب ہوگئیں ان ہی کو روایت کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد مجموعی طور پر ۳۲ ہے اور ان صحابہ کرامؓ میں سے بعض نے تو اجماع کے حجت ہونے کے متعلق کئی کئی حدیثیں روایت کی ہیں۔ لہٰذا اجماع کے حجت ہونے پر دلالت کرنے والی احادیث کی تعداد تو بہت ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ پھر صحابہ کرام کے بعد ان حدیث کے راویوں کی تعداد ہر زمانے میں بڑھتی ہی چلی گئی ہے۔ ان میں سے ہر حدیث اگرچہ الگ الگ خبرِ واحد (غیر متواتر) ہے اور ان کے الفاظ اور بعض مضامین بھی باہم مختلف ہیں مگر اتنی بات ان سب احادیث میں مشترک اور متواتر پائی جاتی ہے تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ یا عمل ہر لغزش سے پاک ہے۔ اس طرح اجماع کا حجت ہونا تواتر

سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے۔ یہاں سب احادیث کے الفاظ الگ الگ نقل کرنے کا توموقع نہیں، مثال کے طور پر ہر مضمون کی صرف ایک ایک حدیث ذکر کی جاتی ہے۔ اسی مضمون کی دوسری احادیث قدرے مختلف الفاظ میں روایت کرنے والے صحابہ کرام کے صرف اسمائے گرامی درج کیے جائیں گے۔

۱۔ عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ میری اُمّت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت (مسلمین) پر ہے اور جو الگ راستہ اختیار کرے گا، جہنم کی طرف جائے گا۔ اس حدیث کو ابن عمرؓ کے علاوہ سات اور صحابہؓ نے بھی روایت کیا ہے۔ کسی نے تفصیل سے کام لیا ہے کسی نے اختصار سے، مگر اتنا مضمون سب نے نقل فرمایا ہے:- اُمّتِ محمدیہ کو اللہ تعالیٰ گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔ اس حدیث کے باقی سات راوی صحابہ یہ ہیں۔

۱۔ حضرت ابن عباسؓ (جامع ترمذی۔ ابواب الفتن)۔ ۲۔ حضرت انسؓ (سنن ابن ماجہ۔ ابواب الفتن)۔ ۳۔ حضرت ابومالکؓ اشعری (سنن ابی داؤد۔ کتاب الفتن)۔ ۴۔ حضرت ابولبصرہؓ (مسند احمد۔ باب فی الاجماع۔ جلد ۱ص ۱۷۷)۔ ۵۔ حضرت قدامہ بن عبداللہ بن عمار الکلابیؓ (مستدرک حاکم۔ جلد ۲ ص ۵۰۷)۔ ۶۔ حضرت ابوہریرہؓ (کتاب الفقیہ للخطیب البغدادی۔ جزو خامس ص ۱۶۲)۔ ۷۔ حضرت ابومسعودؓ (مستدرک حاکم۔ جلد۴۔ ص ۵۰۷)۔ ۸۔ حسن بصری تابعیؒ (التقریر والتحبیر جلد ۳ ص ۸۵)۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "الجماعۃ" (مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت) کو اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تائید و رہنمائی حاصل ہے جو اُس کو ہر خطا سے بچاتی ہے۔ اُن کے متفقہ عقیدے یا عمل کے خلاف جو بات ہو گی غلط اور باطل ہو گی۔ اسی لیے حدیث میں "الجماعۃ" کے اتباع کا حکم بڑی تاکید سے دیا گیا ہے اور اُن سے الگ راستہ اختیار کرنے والوں کو بتایا گیا کہ ان کا راستہ جہنم کا راستہ ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جس شخص نے جماعت مسلمین سے علیحدگی اختیار کی اور اسی حالت میں مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔" (بخاری و مسلم)

"جاہلیت" قرآن وسنت کی اصطلاح میں اُس دور کو کہا گیا ہے جب عرب میں کفر کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اسلام کا سورج طلوع نہ ہوا تھا۔ اس حدیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے "الجماعۃ" سے علیحدگی اختیار کرنے یا ان کے متفقہ فیصلے سے انحراف کرنے کو کتنا سنگین جرم قرار دیا ہے۔ آپؐ نے اس کی ممانعت میں اتنی تاکید سے کام لیا کہ معتبر کتب حدیث میں صرف اسی مضمون کی اٹھارہ حدیثیں راقم الحروف کو ملی ہیں جو سولہ صحابہ نے روایت کی ہیں۔ ان میں "الجماعۃ سے علیحدگی" کی نہ صرف شدید مذمت کی گئی بلکہ اس پر دنیا و آخرت کی سخت سزائیں مختلف انداز میں بیان فرمائی ہیں۔ کئی حدیثوں میں ارشاد ہے کہ جس نے الجماعۃ سے بالشت بھر علیحدگی اختیار کی اور مرگیا تو وہ "جاہلیت" کی موت مرا۔ کچھ حدیثوں میں ارشاد ہے کہ۔ فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ" اُس نے اسلام کا پھندا اپنی گردن سے نکال دیا)۔ کہیں ارشاد ہے کہ "دخل النار" (وہ آگ میں داخل ہوگا)۔ کہیں ارشاد ہے کہ "فلا حجۃ لہ (اس کے پاس کوئی دلیل نہ رہی)۔ کہیں ارشاد ہے کہ "فلا تسئل عنہم" (ایسے لوگوں کا کچھ حال نہ پوچھو)۔ کہیں فرمان ہے کہ "فاقتلوہ" (اُسے قتل کر ڈالو)۔ کہیں حکم ہے کہ۔ فاضربوا عنقہ کائناً من کان" (اُس کی گردن مار دو خواہ کوئی کیوں نہ ہو)۔ کہیں فرمایا کہ "فان الشیطان مع مفارق الجماعۃ یرکض" (جو شخص الجماعۃ سے علیحدگی اختیار کرے اُس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے، جو اُسے ایڑ لگاتا رہتا ہے)۔ کہیں فرمایا کہ "اقتلوا الفذ من کان من الناس" (علیحدگی اختیار کرنے والے کو قتل کر دو خواہ وہ کوئی بھی آدمی ہو)۔ کہیں ارشاد ہے "و اما ترک السنۃ فالخروج من الجماعۃ" (ترک سنت یہ ہے کہ الجماعۃ سے خارج ہو جائے)۔ ایک صحیح حدیث میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ کسی کلمہ گو مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں حلال ہوتا ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ "التارک لدینہ المفارق للجماعۃ" (اپنے دین کو چھوڑنے والا یعنی الجماعۃ سے علیحدگی اختیار کرنے والا ہو)۔

---

[1] یا اس کے لیے سزائے موت ہے۔ (ت۔ ص)

جن سولہ صحابہ نے یہ حدیث روایت کی ہیں اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت ابن عباسؓ (بخاری۔ کتاب الفتن و مسلم کتاب الامارۃ)۔ ۲۔ حضرت عثمان غنیؓ (ترمذی۔ جلد ص ۲۰۳)۔ ۳۔ حضرت عرفجہؓ (مسلم۔ کتاب الامارۃ و نسائی۔ کتاب المحاربہ)۔ ۴۔ حضرت اسامہ بن شریکؓ (نسائی۔ کتاب المحاربہ)۔ ۵۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ (مسلم۔ کتاب القسامہ و ترمذی۔ ابواب الدیات)۔ ۶۔ حضرت ابوہریرہؓ (مستدرک۔ کتاب العلم)۔ ۷۔ حضرت ابوذر غفاریؓ (ابوداؤد۔ کتاب السنۃ)۔ ۸۔ حضرت حارث اشعریؓ (ترمذی۔ ابواب الامثال و مستدرک۔ کتاب العلم)۔ ۹۔ سیدنا معاویہؓ (مستدرک۔ جلد اوّل ص ۱۱۸)۔ ۱۰۔ حضرت ابن عمرؓ (مستدرک مع تلخیص۔ جلد اوّل ص ۱۱۸۔۱۱۹) ۱۱۔ حضرت حذیفہؓ (مستدرک۔ جلد اوّل ص ۱۱۹)۔ ۱۲۔ حضرت عامر بن ربیعہؓ (کتاب الفقیہ والمتفقہ۔ جزء خامس، ص ۱۶۴)۔ ۱۳۔ حضرت فضالہ بن عبیدؓ (مستدرک۔ ج ۱ ص ۱۱۹)

۱۴۔ حضرت ابن مسعودؓ (مسلم کتاب القسامۃ و ترمذی۔ ابواب الدیات)۔ ۱۵۔ حضرت ابومالک اشعریؓ (ترمذی۔ ابواب الدیات)۔ ۱۶۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد۔ جزء سادس، ص ۲۳۳)۔

۳۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد خیف (منیٰ) میں حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا کہ:۔ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ اُن کی موجودگی میں کسی مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا۔ ۱۔ عمل میں اللہ کے لیے اخلاص۔ ۲۔ مسلمانوں کی خیر خواہی۔ ۳۔ اور جماعتِ مسلمین کا اتباع، کیونکہ دُعا پیچھے سے اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے اعتقاد اور عمل میں جماعت مسلمین کا اتباع کرے گا، خیانت اور گمراہی سے محفوظ رہے گا۔ اِس حدیث کا حاصل بھی وہی ہے کہ جماعتِ مسلمین کا متفقہ عقیدہ یا عمل کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

اس حدیث کو دسؔ صحابہ نے روایت کیا ہے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت ابن مسعودؓ (مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب العلم جلد ۱ ص ۳۵)۔ ۲۔ حضرت انسؓ (مسند احمد۔ جلد ۳ ص ۲۲۵)۔ ۳۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ (ابن ماجہ۔ کتاب المناسک و مسند احمد۔ جلد ۴ ص ۸۰)۔ ۴۔ حضرت زید بن ثابتؓ (مسند احمد۔ جلد ۵

ص ۱۸۳) - ۵ - حضرت نعمانؓ بن بشیر (مستدرک حاکم - کتاب العلم، جلد ص ۸۸) - ۶ - حضرت ابوسعید خدریؓ (مجمع الزوائد - جلد اوّل ص ۱۳۷) - ۷ - حضرت ابودرداءؓ - ۸ - حضرت معاذؓ بن جبل - ۹ - حضرت جابرؓ - ۱۰ - حضرت ابوقرصافہؓ (مجمع الزوائد - جلد اوّل صفحات ۱۳۸ - ۱۳۹)۔

ترمذی میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ اور میری اُمت ۳، فرقوں میں بٹ جائے گی، یہ سب آگ میں جائیں گے سوائے ایک فرقے کے" صحابہؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! وہ کونسا فرقہ ہے؟" فرمایا: "وہ جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عبداللہ بن عمرو بن العاص کے علاوہ مزید پانچ صحابہ کرامؓ نے تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ روایت کیا ہے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

۱ - سیدنا معاویہؓ (سنن ابوداؤد - کتاب السنۃ ومشکوٰۃ - جلد ۱ ص ۳۰) - ۲ - حضرت عوفؓ بن مالک (سنن ابن ماجہ - ابواب الفتن) - ۳ - حضرت انسؓ (مجمع الزوائد - کتاب قتال اہل البغی، جلد سادس، ص ۲۲۶) - ۴ - عمروؓ بن عوف (مجمع الزوائد کتاب الفتن، جلد ۷، ص ۲۶۰) - ۵ - حضرت ابواُمامہؓ باہلی (مجمع الزوائد کتاب الفتن، جلد ۷، ص ۲۵۸) -

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت میں فساد اور بگاڑ پھیل جانے کے باوجود مسلمانوں کا ایک فرقہ حق پر قائم رہے گا۔ پوری اُمت کا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہ ہوگا۔ جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جو "حجیت اجماع" کا ہے کہ اُمت کا متفقہ عقیدہ، عمل، یا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ اس کا اتباع فرض اور مخالفت حرام ہے۔

(باقی)

سیکولرازم

اُصول ومبادی، تاریخ وتنقید

غزل کاشمیری اُستاذ شعبۂ علومِ اسلامیہ - اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

(۲)

سیکولرازم کے مبادی سیکولرازم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسانی ترقی کے لیے صرف دُنیاوی وسائل پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ دُنیاوی وسائل ہماری دسترس میں ہونے کی بنا پر سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، پھر یہ وسائل ہمارے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں زیادہ آزادی کے ساتھ کارآمد ہو سکتے ہیں، سیکولرازم ایسے دَور میں پروان چڑھا جب سائنس اور مذہب میں علیحدگی کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا، اس مطالبہ کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی خاطر سیکولر حقائق کے آزاد اور غیر جانب دار ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سیکولرازم کی بنیاد موجودہ زندگی کے تجربہ پر رکھی گئی ہے، اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسے عقل کے ذریعے آزما کر تجربے میں لایا جاسکتا ہے۔ یہ محسوس کرتا ہے کہ جس طرح ریاضیات اور کیمیا سیکولر علوم ہیں اسی طرح ایک فلاحی زندگی اور انسانی طرزِ عمل کے بارے میں سیکولر نظریہ قائم کرنا ممکن ہے اور انہی خطوط پر سائنسی تعلیمات کو شعوری ہدایات میں سمویا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سیکولرازم کے مذہب کے ساتھ تعلقات کو معاندانہ کی بجائے منفرد بیان کیا گیا۔ دینیات ان دیکھی دُنیا کی تعبیر کو تسلیم کرتی ہے، سیکولرازم ان دیکھی دُنیا اور اس کی تعبیر سے لاتعلق ہے۔ وہ اس جانی پہچانی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے جس کی تجربہ سے تعبیر کی گئی ہے۔ یہ کسی اُخروی زندگی کی کوئی پیش کش کرتا ہے اور نہ ہی اس سے منع کرتا ہے۔ توحید یا الحاد سیکولر سکیم کا جزو نہیں ہیں

کیونکہ دونوں کسی تجربہ سے ثابت نہیں ہیں۔ جہاں تک دینیات کی اخلاقی تعلیمات کا تعلق ہے، وہ اس کے ساتھ اشتراک رکھتا ہے، لیکن وہ اِن عقاید کی بنیاد ایسی تجویز کرتا ہے، جو دینی عقائد سے آزاد ہے۔ سیکولرازم انہی لوگوں کے لیے باعثِ کشش ہے، جو مختلف اسباب کی بنا پر دینیات سے غیر مطمئن ہو چکے ہوں۔ سیکولرازم یہ تجویز کرتا ہے کہ مکمل اخلاقیات صرف سیکولر سوچ کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے، جس طرح کہ وہ مسالہ جو کسی مکان میں مستعمل ہوتا ہے اس مہندس کے بغیر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، جس نے خود اس مکان کو بنوایا ہو۔ سیکولرازم اس بات پہ زور دیتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ کہیں اور "روشنی نہیں ہے اگر ہے تو وہ انسانی مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتی۔ دینی عقیدہ جب تک انسانی مسرت کے سامنے عملی رکاوٹ بن کر کھڑا نہیں ہو جاتا سیکولرازم اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیتا ہے، چاہے جیئے، چاہے مرے۔ لیکن تاریخی لحاظ سے سیکولرازم ہمیشہ الحاد کے ساتھ مختلط رہا ہے۔ اگرچہ ہولی اوک نے ہمیشہ ان دونوں کے مابین امتیاز پہ زور دیا ہے۔ اُس نے سیکولر اُصولوں پہ بریڈلاف کے ساتھ ہنسی خوشی اتحاد کر لیا، اسی طرح وہ ہر اُس شخص کی طرف دستِ تعاون بڑھانے کو تیار تھا جو سیکولر ذرائع کے ساتھ انسانیت کی باہمی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا چاہتا تھا، وہ توحید اور الحاد دونوں کو ایک قسم کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدہ پرستی خیال کرتا تھا، اس کے برخلاف بریڈلاف کا یہ خیال تھا کہ "سیکولرازم کا فرض ہے کہ وہ مذہبی اعتقاد کا مقابلہ کرے، جب تک یہ توہمات اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ مادی ترقی کا تصور محال ہے" — سیکولرازم دعویٰ کرتا ہے کہ استدلال کے قوانین — عقل و فہم — کے ذریعے اُس کے اُصولوں کی ترتیب و تہذیب کر کے انہیں تمام انسانیت پر مساوی انداز میں لاگو کیا جا سکتا ہے، وہ کہتا ہے "اخلاق کی بنیاد استدلال پہ ہے، غلطی علم میں ہوتی ہے نہ کہ ارادہ میں"۔

ہولی اوک کے نزدیک ایسے مادی حالات پیدا کرنا ممکن ہے جن کی وجہ سے افلاس اور محرومی کی جڑ اُکھاڑی جا سکتی ہے۔ افادیت پسندوں کی طرح وہ بھی اس بات کا قائل تھا کہ یہ حقیقت بذاتِ خود روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے کہ "اخلاق ہی ایک ایسا عمل ہے جو انسانیت کی

مشترکہ فلاح و بہبود کو قائم کرسکتا ہے" اس کے نزدیک جس طرح سائنس انسانی صحت کے اصول بتاسکتی ہے۔ اسی طرح انسانی خوشحالی کے اصول بھی بتاسکتی ہے۔ انسانی خوشحالی کے حصول کے لیے ہمیں استدلال سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن استدلال کو بروئے کار لاتے ہوئے وقت ہمیں ذاتی خواہشات کی پیروی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ استدلال میں ذاتی ارادہ شامل کرکے ہم نہ تیقن حاصل کرسکتے ہیں اور نہ ہی نظم وضبط حاصل کرسکتے ہیں۔ صحیح تیقن اور تنظیم کا دفاع صرف غیر جانبدار عقل ہی کرسکتی ہے، لہٰذا عقل کو آزاد رکھنا ضروری ہے۔ علم الاخلاق اور مذہب پر تحقیقات سائنسی تحقیقات کی طرح آزادی سے ہونی چاہیے، کسی بھی تحقیق، تنقید اور اشاعت پر قانونی یا روحانی سزا نہیں ہونی چاہیے، زندگی کا یہ عملی نظریہ پیش کرکے سیکولرازم ایک ایسا مقصد پورا کرتا ہے جو بقول اس کے مذہب ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ حق کو سند مانتا ہے نہ کہ سند کو حق۔ وہ افادۂ تقوٰی کو تقوائے افادہ پر ترجیح دیتا ہے۔

IT TAPES TRUTH FOR AUTHORITY, NOT AUTHORITY FOR TRUTH, AND SUBSITUTES THE PIETY OF USEFULLNESS FOR THE USEFULLNESS OF PIETY.

جو بھی انسانیت کے لیے احسن ہوگا، وہ اس عقل کے ذریعے طے ہوگا جسے تجربہ کی بھٹی سے نکالا گیا ہوگا، اور "خلاق انسانیت" یقیناً اس پر صاد کرے گا، یہ جدید تقوٰی خود اپنے بل بوتے پر اپنا اظہار کرے گا، اور "داتائے کل" متلوّن التجاوٗں سے دق نہیں ہوگا۔ ہم عملی طور پر عمومی قوانین کے تابع ہیں۔ اور انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان قوانین کا کھوج لگائے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔

سیکولرازم کی ترقی کی فضا انیسویں صدی کے وسط میں سیکولرازم کے اثرات زیادہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائیت دشمن ردّعمل سیکولرازم اور اس کے اتحادی نظریات کی یادگار تحریک تھی، مگر بعد میں یہ تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہونے لگا اور منتظم عقلیت پسندی میں ضم ہوکر اپنے آزاد وجود سے محروم ہوگیا، آج کل عقلیت پسندی ہی سیکولر روح کی جدید تر اشکال پیش کررہی ہے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سیکولرازم کا سنہرا دور وہی

تھا جب وہ اپنے ہمدردوں کے مذہب دشمن پراپیگنڈہ کے ساتھ کلی طور پر متفق ہوگیا تھا۔ مثلاً بریڈلاف سیکولر تحریک میں شامل ہوگیا حالانکہ ہولی اوک سیکولرازم میں "دہریت" کو شامل کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا، مگر رفتہ رفتہ سیکولرازم میں "دہریت" کے مباحث ختم ہوگئے، اس میں قدیم رنجشیں دور ہوگئیں۔ سائنس اور مذہب کی علیحدگی کا ایک معتدلانہ نظریہ غالب آگیا لیکن انہی اشیاء کے ساتھ سیکولرازم کی اصل خصوصیت ختم ہوگئی اور اسے منظم تحریک کی شکل میں زندہ رکھنا محال ہوگیا، کیا اب یہ اپنی روح اور اصولوں کے ساتھ اپنا احیا کرسکے گا؟ اس میں بہت کچھ شک وشبہ کی گنجائش ہے۔

سیکولرازم مادی کرہ میں عالم انسانی اور مفاد انسانی کی محدودیت کا قائل ہے۔ یہ نظریہ اگرچہ ممکن ہے اور عملی طور پر یقیناً مبنی برحق ہے لیکن نظریاتی نقطہ نظر سے اسے حق ثابت کرنا نہایت مشکل ہے اور سیکولرازم یہی ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کرتا ہے۔ عملی لحاظ سے دیکھا جائے تو ایسے لاکھوں لوگ ملیں گے جن کے مفادات اور تعلقات زندگی کے مادی پہلوؤں سے وابستہ ہوتے ہیں اور یہی رویہ دنیا میں قابل عمل بھی ہے، کیونکہ لوگوں کی اکثریت زندگی اور عمل کے بارے میں کوئی شعوری نظریہ نہیں رکھتی، اور نہ ہی انہیں کسی نظریہ کی ضرورت ہے، گویا نظریہ کے عدم وجود سے عملی سیکولرازم جاری وساری ہے، سیکولرازم کی کمزوری اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ انسانیت کو اسی قسم کے غیر ضروری اور نامکمل دلائل مہیا کرتا ہے جن کو چاہے بغیر وہ سیکولرازم کے مقاصد پورے کررہی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے "فطری حقیقت پسندی کے سادہ انسان" کو فلسفیانہ بنیادیں مہیا کرنے کی کوشش کی جائے۔ حالانکہ یہ سادہ انسان خارجی حقیقت کے وجود کے لیے جو اس کی شہادت کو ہی ناقابل تردید ثبوت قرار دیتا ہے۔ یہ خارجی حقیقت ویسی ہی ہے جیسی ہمارے سامنے موجود ہے۔ عملی لحاظ سے اس کے لیے فلسفیانہ بنیاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی نظریاتی لحاظ سے یہ بنیاد دی جاسکتی ہے، کیونکہ فلسفہ گام اولین پر ہی سادہ انسان کے مفروضات کو غیر تسلی بخش قرار دیتا ہے۔ یہی حال سیکولرازم کا ہے، بے شمار لوگ عملی لحاظ سے سیکولر ہیں۔ لیکن زندگی یا عمل کے بارے میں ہر نظریہ بحث طلب ہوتا ہے اور سیکولرازم ان کو نظر انداز کر دیتا ہے، اگرچہ ہولی اوک نے دعویٰ کیا تھا کہ

سیکولرازم زندگی اور عمل کا نظریہ ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ "لاادریت" کی طرح —— جس کا یہ پُرجوش اتحادی ہے —— ان میں سے ایک کا انکار کرتا ہے۔ چونکہ یہ عمل کو غیر ضروری قرار دیتا ہے لہٰذا ناکام ہوگیا، کیونکہ اس کے پاس اب مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی عملی لحاظ سے کوئی فرد اپنے مفادات کو "نظریۂ محدودیت" کے بغیر محدود کرسکتا ہے اور "نظریۂ منقبت" کے بغیر ان کی نفی کرسکتا ہے، تاہم جب ہم اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں "ہمیں اپنا علم محدود کیوں رکھنا چاہیے؟ تو ہم پر قبول یا رد کا رویہ اختیار کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ جب کہ برخلاف اس کے مذہب ایک ایسا علم بھی فراہم کرتا ہے جو مادی تعلقات سے ماوراء ہے۔ اس معاملہ میں بریڈلاف ہولی اوک سے زیادہ استقامت کا ثبوت دیتا ہے، اس حقیقت کو مزید تقویت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ سیکولرازم اس وقت بہت جاندار بن جاتا ہے جب اُسے مذہب دشمن نظریات کے ساتھ منسلک کیا جائے، مذہب سے انکار کی بجائے اس سے چشم پوشی کرنا ناقابلِ عمل ہے، کیونکہ مذہب دُنیاوی اور رُوحانی دونوں تعلقات کو باہم دیگر ملا کر پیش کرتا ہے۔ مذہب زندگی کے سیکولر نظریے کا انکار کرتا ہے۔ سیکولر نظریہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ مذہب کے اس دعوے کا توڑ پیش نہ کرے کہ وہ زندگی کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ایک محال مفروضہ ہے کہ خدا تو ہے لیکن مادی دُنیا سے لاتعلق ہے، جو شخص بھی خدا پر یقین رکھتا ہے، وہ اس پر تمام حقائق سے "اعلیٰ حقیقت" کے طور پر یقین رکھتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور سچ ہے کہ عملی زندگی میں ایک موحد اپنے اعمال میں خدائی احکامات کو نافذ نہ کرکے قابلِ ذکر حد تک اپنے غیر مستقیم ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ لیکن اس طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک تسلی بخش نظریہ ترتیب دینا نہایت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولرازم اگر مکمل طور پر مذہب دشمن نظریہ نہیں اپناتا تو ناکامی اس کا مقدر رہے گی، فلسفیانہ لحاظ سے سیکولرازم —— جیسا کہ ہولی اوک نے پیش کیا ہے —— کی کمزوری اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ وہ "حقائق" (   ) اور "اقدار" (   ) میں فرق قائم کرنے میں نااہل ثابت ہوا ہے۔ یہی ناکامی مذہب پرستی کی طرف بھی منسوب کی جاسکتی ہے،

جب کہ انیسویں صدی میں اس نے اپنے دعاوی کو سائنسی رنگ میں پیش کرنا چاہا۔

سیکولرازم کے داعیوں کے نزدیک حقائق تجربہ کی تجرید ہیں، اسے سائنس بھی تسلیم کرتی ہے، حقائق کو عقلی علم کے معاملات بھی کہا جاتا ہے، مگر اقدار کی اہمیت و ابدیت صرف عقیدہ کے عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ سیکولرازم ریاضیات اور کیمیا پر قیاس کرکے حقائق کا اخلاقی نظام تعمیر کرنا چاہتا ہے، وہ صرف علم سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ عقیدہ سے اس طرح ایک بنیادی فرق سے اپنی کم عقلی کا ثبوت دیتا ہے، وہ حق کے معیار کے ساتھ تقابلی اقدار کے مابین فیصلہ کرتا ہے، وہ "سچائی" (TRUTH) اور "عقل" (REASON) کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ لیکن ان اصطلاحات کے حقائق کے ساتھ تعلقات کو سمجھے بغیر اظہارِ خیال کرتا ہے، گویا یہ اصطلاحات اقدار کے وجود کا بذاتِ خود ثبوت مہیا کرتی ہیں اور تقابلی اقدار کے مابین .... امتیاز کو واضح انداز میں بیان کرتی ہیں، اس کے برخلاف افادیت پسندی جو فلسفیانہ نظریہ ہے اور جس نے سیکولرازم کو قوت محرکہ عطا کی ہے ـــ ابھی تک غالب تھا اس کے نزدیک سیکولر اخلاقیات پر عمل کرنا ممکن تھا، لیکن جب افادیت پسندی کو بھی زوال آگیا، جس پر سیکولرازم کی فلسفیانہ بنیاد تھی تو لازمی طور پر سیکولرازم کے فلسفیانہ مفروضات بھی ناکام ہوگئے۔ انہی اسباب کی بنا پر سیکولرازم زندگی اور عمل کے نظریہ کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ اور یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے وقت کے حالات کے ساتھ ہی ختم ہوجاتا ہے، اس کے اخلاقی مقاصد قابلِ تحسین ہیں۔ مگر یہ بھی کسی موزوں بنیاد سے محروم ہیں، جس پر قائم ہوکر یہ انسانی افکار کا ایک ابدی خاکہ پیش کرسکے، غالباً یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کی کسی بھی کتاب میں سیکولرازم کا ذکر نہیں ملتا، اسے باقاعدہ عنوان کے تحت کسی بھی کتاب نے جگہ نہیں دی، کیونکہ یہ حیات کی آئیڈیالوجی بن ہی نہیں سکتا، مثلاً حال ہی میں تاریخ فلسفہ پر ایک ضخیم کتاب چھپی ہے جسے فریڈرک کپلیسٹن نے لکھا ہے، اس میں ہر قسم کے فلسفیانہ نظریات کا ذکر ہے مگر سیکولرازم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، برٹرینڈ رسل کی "مغربی فلسفہ کی تاریخ" بھی اس

1- A HISTORY OF PHILOSOPHY, "FREDERICK COMPLESTON. SEARCH PRESS LONDON 7TH IMPRESSION 1976

P.T.O.

کے ذکر سے خالی ہے۔ "فلسفہ کا انسائیکلوپیڈیا" میں اس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مادیت کے مرکز ماسکو نے "فلسفہ کی ڈکشنری" شائع کی ہے، اس میں بھی یہ لفظ ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

غیر مذہبی نظام (LAICISM) فرانس میں سیکولرازم کی جگہ (LAICISM) کی اصطلاح منظرِ عام پر آئی۔ یہ وہ دور تھا جب کہ تیسری جمہوریہ کے ماتحت حقیقی اقدار کے لیے چرچ اور ریاست میں کشمکش جاری تھی۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اس اصطلاح نے چرچ اور ریاست کے مسائل کو سلجھانے کی طرف زیادہ توجہ دی۔

لیس ازم کی روحانی جڑیں نشاۃ ثانیہ، "انسانیت پرستی" اور سب سے بڑھ کر "روشن خیالی" تک جاتی ہیں، یہی وہ دور تھا جب کہ دنیا کی خود مختار اور جبلی قدر کو زندگی کے ہر شعبہ میں تسلیم کیا جانے لگا تھا، مثلاً ریاست، معاشرہ، قانون، معاشیات، ثقافت اور تعلیم میں یہ تحریک توہماتی اور خیالی حاکمیت یا کلیسائی ولایت سے نجات حاصل کرنے کے لیے چلائی گئی تھی، اس دور میں فرد کو اپنی پسند کا مذہب اور پیشہ اختیار کرنے کی آزادی دلائی گئی، مگر یہ حق صرف افراد تک محدود تھا، مذہبی تنظیموں میں ابھی تک اس کا پرچار کارگر ثابت نہ ہو سکا، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ مذہبی کمیونوں کو نجی حقوق کی بنیاد پر ایک علیحدہ تنظیم قرار دے دیا گیا، اور انہیں عوام کا نمائندہ بننے یا عوام کی زندگی پر اثر انداز ہونے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔

مذہب سے نجات حاصل کرنے کے عمل کو جب دستوری قانون بنا یا گیا تو اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست اور مذہب میں علیحدگی وجود میں آنے لگی اور اس کی تکمیل بھی ۹ ستمبر ۱۹۰۵ء کو

باقی حاشیہ صفحہ سابقہ

2— "HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY" BERTRAND RUSSELL, UNWIN UNIVERSITY BOOKS, 7TH IMPRESSION 1974

حاشیہ صفحہ ہذا

1— "THE ENCYCLOPEDIA OF PHILOSOPHY" PAUL EDWARD EDITOR IN CHIEF THE MACMILLAN COMPANY & THE FREE PRESS NEW YARK

کو تیسری جمہوریہ کی قانون سازی میں ہو گئی۔ ۱۸۰۱ء کا پوپ کے ساتھ معاہدہ منسوخ کر دیا گیا، ۱۹۰۴ء میں عدالت پوپ (HOLY-SEE) سے مدبرانہ تعلقات توڑ ڈالے گئے، پبلک فنڈز سے چرچ کی امداد بند کر دی گئی، چرچ کی تمام عمارات ریاست کی ملکیت قرار دے دی گئیں، البتہ پرستش سکھانے کے باضابطہ سرکاری اور سند یافتہ گروہوں کو اور اُن کی بیرونی تنظیموں کو یہ عمارات مفت استعمال کرنے کی اجازت حاصل تھی، ان سرکاری مذہبی اداروں کے مالی انتظامات کی نگرانی بھی ریاست کرنے لگی۔ تیسری جمہوریہ کا تعلیمی نظام ایک قسم کا ریاستی مذہب تھا، جسے "سرکاری الحاد" کہا گیا۔ ۱۷۹۳ء تا ۱۷۹۵ء کے انقلاب کی "محبت خدا و بشر" (THEOPHILANTHROPISM) کو مذہب کا نعم البدل قرار دیا گیا۔ یہ قدم اس وقت اٹھایا گیا جب ۱۸۸۲ء میں ریاستی سکولوں سے مذہبی نصاب ختم کر دیا گیا، اس کی جگہ ریاستی خطوط پر ترتیب دی گئی اخلاقی تعلیمات رکھی گئیں۔ ابتدا میں خدا کے اعتقاد کو اخلاقی تعلیمات کے اوّلین سرچشمہ کے طور پر باقی رہنے دیا گیا، لیکن ۱۸۶۶ء میں معرض وجود میں آنے والی (LIGUEDELIENSEIGNEMENT) نے مطالبہ کر دیا کہ اخلاقیات کو تمام خدائی ہدایات سے پاک کر دیا جائے، اس طرح ریاستی چرچ نے بھی مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، اور یہ نظریہ عالم گیر شہرت حاصل کر گیا، چونکہ مذہبی احکامات آزاد سکولوں کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ لہٰذا قانون سازی کو سب سے زیادہ ان کے خلاف موڑا گیا، ۱۸۸۰ء میں یسوعی مکتبِ فکر پر پابندی عاید کر دی گئی۔ دوسرے کلیسائی فرقوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سرکاری سند حاصل کرنے کے لیے ریاست کو درخواستیں دیں۔ ۱۹۰۱ء کے قانون کے مطابق ہر مذہبی مقام اور جدید عمارتوں کے لیے ریاست کی طرف سے لائسنس حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں بلا استثنا تمام مذہبی مقامات کو ہر قسم کی تبلیغی سرگرمیوں سے منع کر دیا گیا۔ فرانس کی طرح یہ خاص مسئلہ یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی درپیش تھا۔ کہ آیا سکولوں اور تعلیم کو سیکولر ریاست کے تحت رکھا جائے یا کلیسائی فرائض کے تحت؟ جب ریاست نے مذہب سے مکمل خلاصی کی سخت گیر پالیسی اختیار کی تو اس کے خلاف کیتھولکوں کی طرف سے بھی سخت دفاعی جدوجہد کا آغاز ہو گیا، مگر وہ ریاست کے سیکولر (CREDO) کو سننے اور دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ جمہوری ریاست اس حکم کو نافذ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ فرانسیسی کیتھولکوں کی اکثریت

اپنی سیادت کی بقا کی موہوم اُمیدوں پہ زندہ تھی - کیونکہ یہی کیتھولک چرچ کے خارجی بقا کی واحد ضمانت تھے، کیتھولکوں کا یہ عملی قدم محض خود حفاظتی کا ایک ذریعہ تھا، اس پہ ریاست زیادہ سخت مزاج ہوتی گئی - فرانسیسی کیتھولکوں کی اکثریت کو دوسری جنگِ عظیم کی اتھل پتھل کے بعد گوشہ گمنامی سے نجات ملی، وہ اپنی مذہبی سیادت کو دوبارہ حاصل کرنے کی سعی کرنے لگے - اگرچہ پوپ کے اعلانات محض دفاعی انداز کے حامل تھے - انہوں نے اپنے اطوار میں راہ اعتدال اختیار کرنے کی پالیسی اپنانی شروع کر دی، کارڈی نال لاوی جیری نے مصالحانہ تنبیہات کرنی شروع کر دیں - ۱۹۰۶ء میں پائس دہم (PIUS X) نے اپنے خطبوں میں چرچ کے معقول اور جائز طریق کار میں دخل اندازی کی مذمت کی، اس نے چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو بھی مسترد کیا - ۱۹۲۵ء میں پائس یازدہم (PIUS XI) نے اپنے پمفلٹ میں (LAICISM) کو چرچ کے ذخیرہ الفاظ میں شامل کر لیا - جہاں تک چرچ کا تعلق ہے، اس کی راہبانہ ہوشیاری برقرار رہی اور ریاست کے ساتھ جدید تعلقات کی وجہ سے اس میں مزید پختگی آگئی، جہاں تک ریاست کا تعلق ہے تو وہ چرچ سے علیحدگی کے قوانین بڑی بردباری اور نرمی کے ساتھ نافذ کر رہی تھی، بہر حال چرچ اور سٹیٹ کے مابین خلیج کو ایک معاہدہ کے ذریعے پاٹ دیا گیا، ۱۹۲۱ء میں عدالت پوپ (HOLY SEE) کے مدبرانہ تعلقات کو بحال کر دیا گیا - جب ۱۹۵۴ء میں عہدہ اسقف کا فرانسیسی اعلان ہوا تو چرچ نے یہ پالیسی اختیار کی کہ باہمی تبادلہ خیالات کے لیے دروازہ کھلا رکھا جائے - چنانچہ ۱۹۵۸ء میں (LAICISM) کے مفہوم کو واضح کر دیا گیا کہ " ریاست اور عوامی اداروں کا وہ قانونی حق اور اقتدار اعلیٰ جسے عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر ریاست استعمال کرے گی، اس کی بنا پر پبلک لا کے تحت مذہبی تنظیموں کے وجود اور شہریوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی جائے گی "
جہاں تک سکولوں اور تعلیم کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کیمبرائے (CAMBRAI) کے آرچ بشپ ای - ایم گوری (E-M-GUERRY) کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے: " جہاں تک ریاستی سکولوں کا تعلق ہے تو یہ کسی فرقہ واریت کے تحت نہیں ہوں گے اور نہ اُن کا کوئی خاص نام رکھا جائے گا، بلکہ یہ غیر جانب دار ہوں گے، نہ یہ مذہب کے حق میں بیان دیں گے اور نہ یہ مذہب کو مسترد کریں گے "
آرچ بشپ نے کہا یہ قدم (LAICISM) کے اُلٹ ہے. کیونکہ یہ ایک فلسفیانہ

(باقی بر صفحہ ۵۵)

ایک آیتِ قرآنی

جناب نعیم صدیقی صاحب

اِس وقت گفتگو کا محور سورۃ انعام کی پچاسویں آیت ہے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ وہ ایک بات صاف صاف طور پر لوگوں سے کہہ دیں۔

آیت کے الفاظ یہ ہیں:-

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

اے پیغمبر! کہہ دیجیے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب جانتا ہوں، اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ پھر ان سے پوچھو: کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا غور نہیں کرتے؟

اِس آیت کا مضمون واضح کرنے سے پہلے دو باتیں بیان کرنا ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ خدا کے رسولوں اور نبیوں کے متعلق شروع سے ایک خیال یہ موجود رہا ہے کہ انہیں عام انسانوں کے مقابلے میں جسمانی اور مالی لحاظ سے غیر معمولی فوقیتیں حاصل ہونی چاہئیں، جنہیں دیکھتے ہی ہر شخص جان لے کہ فلاں آدمی خدا کا خاص آدمی ہے اور خدا کی طرف سے پیغمبری پر

مقرر کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ رسولوں کی اصل دعوت پر عقلی اعتراضات اُٹھانے کے بجائے مخالفین نے بالعموم کٹ حجتیوں سے کام لیا ہے۔ اصل بحث تو اس پر ہونی چاہیے تھی کہ جو دعوت دی جا رہی ہے وہ دعوتِ حق نہیں ہے، اس کی بنیاد واضح حقائق پر نہیں ہے، وہ اچھے انسان نہیں بناتی، وہ اخلاق کی سطح کو بلند نہیں کرتی، وہ تمدن و معاشرت کی گتھیوں کو سلجھا نہیں سکتی۔ وہ انسانی فلاح و بہبود کا ذریعہ ثابت نہیں ہو رہی۔ لیکن اس بحث سے ہٹ کر مخالفینِ دینِ حق طرح طرح کے نکتے چھانٹتے تھے۔ اور غلط مبحث کرتے تھے۔ ایسی ہی کٹ حجتی تھی جس کے جواب میں سورۂ الانعام کی آیت ۵۰ نازل ہوئی۔ اور قرآن کے دوسرے مقامات میں یہی مضمون مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ ہدایت کو سن کر مخالفین چہ می گوئیاں کرتے تھے اُن کا ایک طرزِ فکر یہ تھا کہ:۔

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝

الانبیاء ۔ ۳۔

یہ ظالم لوگ خفیہ طور پر آپس میں چہ می گوئیاں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص بس تمہاری طرح کا ایک انسان ہی تو ہے۔ پھر کیا تم جادو کا شکار ہو رہے ہو؟ حالانکہ سب کچھ دیکھ رہے ہو؟

مطلب یہ تھا کہ خدا کے اس نبی کا جسم ہمارا ہی طرح کا ہے۔ ہماری ہی طرح کی اس کی ضروریات ہیں، ہماری ہی طرح کی اس کی تکالیف ہیں۔ پھر اسے نبی ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ہم لوگ دیکھتے سمجھتے مسحور ہو رہے ہیں۔

اس کا جواب یوں دیا گیا:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (الانبیاء ۔ ۷)

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول نہیں بھیجے، مگر یہ کہ وہ آدمی تھے، جن پر وحی کی جاتی تھی۔

اِس جواب کی تکمیل آگے کی آیت نمبر ۸ میں یوں کی گئی ہے:

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (انبیاء ۸)

اور ہم نے ان کو ایسے وجود نہیں دیئے کہ وہ کھانا کھانے سے بے نیاز ہوں اور نہ وہ ہمیشہ کی دُنیوی زندگی رکھتے تھے۔

سورۃ الفرقان میں مخالفین کی بات ذرا کھول کر بیان کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۷ اور ۸۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ

اب پوری بات کھُل گئی۔ "ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ رسول کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں آتا جاتا ہے۔ کیوں نہ اس کے لیے کوئی فرشتہ بھیجا گیا کہ وہ اُس کا محافظ ہوتا، یا اس پر کوئی خزانہ اُتار دیا گیا ہوتا، یا اُس کے لیے کوئی ایسا باغ ہوتا جس کی پیداوار وہ کھاتا۔"

یعنی مطلب یہ کہ جو خدا کا رسول ہو، اُسے جسمانی ضروریات نہیں ہونی چاہئیں، اُسے خوراک کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لیے کوئی فرشتہ بطور چوبدار مقرر ہونا چاہیے، جو اُس کے آگے ڈنڈا لیے ہٹو بچو کی آواز لگاتا ہو کہ لوگو ایک طرف ہو جاؤ، خدا کا رسول آرہا ہے، یا اس کے لیے کسی خزانے کا انتظام کیا جاتا کہ وہ معاش کی مصیبتوں میں نہ پڑتا، یا نہیں تو اُس کے لیے کوئی باغ ایسا فراہم کر دیا جاتا جس کی پیداوار اور آمدنی سے وہ بغیر کسی تگ و دَو کے زندگی کی ضرورتیں پوری کرتا۔

اِن باتوں کے علاوہ وہ اپنی چہ می گوئیوں میں یہ بحث بھی اُٹھاتے کہ یہ شخص خدا کا رسول ہوتا تو اسے غیب کے سارے احوال معلوم ہوتے، یہ بتاتا کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ کسی کے ہاں اَولاد ہوگی یا نہیں؟ اولاد ہوگی تو وہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ یہ ہمیں بتا سکتا کہ ہم نے رات کیا کھایا تھا اور ہمارے گھروں میں کیا محفوظ پڑا ہے؟ اگر یہ خوبیاں نہیں ہیں تو کوئی شخص خدا کا رسول

کیسے ہو سکتا ہے۔

اسی کا جواب سورہ انعام کی آیت ۵۰ میں دیا گیا ہے۔ خدا اپنے رسول کو ہدایت کرتا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میرا دعویٰ نہیں ہے کہ میرے قبضے میں اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ مجھے غیب کا علم ہے اور نہ میں اپنے آپ کو فرشتہ قرار دیتا ہوں، بلکہ میرا امتیاز یہ ہے کہ جو کچھ وحی کیا جاتا ہے اس کی پیروی کرتا ہوں۔ آگے متصلاً ایک ارشاد یہ آتا ہے کہ ھل یستوی الاعمٰی والبصیر؟ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔ یعنی ایک تم ہو کہ جن کے پاس اپنے جی سے گھڑی ہوئی باتوں کے سوا کچھ نہیں، ایک میں ہوں کہ جسے وحی کی روشنی میں ہدایت کا راستہ معلوم ہے پھر کیا تم اور میں برابر ہو سکتے ہیں۔ یعنی انسان ہو کہ بھی ہم میں بڑا فرق ہے۔ ایک ہدایت سے محروم ہے اور ایک ہدایت یافتہ اور دوسروں کو ہدایت دینے والا ہے۔

ایسا ہی جواب سورۂ ہود کی آیت ۳۱ میں ہے۔ مگر وہ جواب جو سورہ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان مبارک سے دلوایا ہے وہ سورۂ انعام کی آیت کو اور روشن کر دیتا ہے۔ فرمایا:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ڔ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ڔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

الاعراف - ۱۸۸

اے نبی ان سے کہہ دو کہ میں اپنی جان کے نفع نقصان پر اختیار نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ جو کچھ اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو ضرور منفعتوں کو سمیٹ لیتا اور مجھے کوئی تکلیف لاحق نہ ہو سکتی۔ مگر میں تو صرف ایمان لانے والے گروہ کے لیے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔

صاف واضح کر دیا کہ دنیوی لحاظ سے اپنے نفع نقصان یا آرام اور تکلیف پر قابو نہیں رکھتا۔ میں غیب نہیں جانتا ورنہ ہر خرابی سے بچ نکلتا۔ اور تمام فائدوں اور آراموں کو جمع کر لیتا۔

مخالفوں کے مغالطے کو رفع کرنے کے لیے اور زیادہ جامع بات حضورؐ سے کہلوائی گئی سورۂ یونس

کی آیت ۶۵ میں ہے کہ :-

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ .....

ترجمہ یہ ہے کہ: اللہ کے سوا زمین و آسمان میں کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا۔

مگر اس نفی کے ساتھ ایک اثبات بڑا واضح ہے۔ قرآن میں جابجا اس طرح کا کلام بھی ملتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ - (آل عمران-۴۴) - (سورہ یوسف ۱۰۲)-

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ - (ھود-۴۹)

بلکہ بات کو اگر پھیلا کر سامنے رکھا جائے تو سارا قرآن علم غیب کا ایک دفتر ہے۔ اللہ نے جو بھی علم غیب اپنے رسولؐ کو دیا ہے یا وہ وحی کی شکل میں ہے جو قرآن میں محفوظ ہے، یا پھر وہ مشاہدات کی شکل میں ہے، جیسے جبریل کی ملاقات، جنوں کی حاضری، سفرِ معراج کے حقائق۔ تیسری شکل مستقبل کے احوال کی پیش گوئیوں کی ہے۔ یہ ساری چیزیں حضورؐ کی احادیث میں آگئی ہیں۔ خدا کی طرف سے جو بھی علم غیب حضورؐ کو دیا گیا۔ وہ اصلاً ہدایت اور دین کا علم تھا۔ اور اس علم کے متعلق حضورؐ نے خدا کے اس فرمان کو پورا کیا۔ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔

آخر میں سورۂ انعام کی پچاسویں آیت کے متعلق ہم اسی حقیقت کو دوہراتے ہیں کہ خدا اپنے انبیاء کو ایک تو غیر انسانی اوصاف کے ساتھ نہیں بھیجتا، دوسرے اُن کے لیے نہ چتر کے انتظامات ہوتے ہیں، نہ فرشتے حوالداری کے لیے مقرر ہوتے ہیں۔ تیسرے ان کو امتیازی طور پر خزائن یا دولت کے وسائل نہیں دیے جاتے۔ چوتھے اُن کو وحی اور مشاہدات کے علاوہ کوئی اور علم غیب نہیں دیا جاتا۔ جس کی اُن کے منصب کے لیے ضرورت نہ ہو۔ خدا کا یہ قانون نہیں کہ وہ کسی مخلوق پر غیر ضروری بار ڈالے۔

استغفر اللہ لی و لکم اجمعین

مطبوعات

فقہ الزکوٰۃ حصہ سوم از علامہ یوسف القرضاوی - مترجم (عربی سے) ساجد الرحمٰن صدیقی باہتمام ادارہ معارف اسلامی، کراچی - شائع کردہ - البدر پبلی کیشنز - ۲۳ - راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور - قیمت مجلد -/۳۰ روپے

اس کتاب کے حصہ اوّل کی اشاعت پر ہم نے تعارف کرا دیا تھا۔ حصہ دوم پر بھی چند سطور مطبوعات میں لکھی گئیں۔ اب اسی کتاب کا حصہ سوم سامنے ہے۔ مختصراً پھر یہ بات عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خاص زکوٰۃ کے موضوع پر اتنی بڑی اور جامع ایک ہی یہ کتاب مرتب ہو کر سامنے آتی ہے۔ علامہ قرضاوی کے علمی مرتبے کی گواہی ان کی متعدد تصانیف دیتی ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت سلیس فصیح عربی زبان میں مطالب کو پیش کرنا ہے۔ اُن کی تحریر میں خاص کشش ہے۔ زکوٰۃ کا موضوع احیائے اسلام کی تحریکی رَو کے ساتھ ساتھ ہر مسلم مملکت میں اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ اس بارے میں عوام اور نوجوان ہی نہیں، خواص بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ اس دَور کے نظامِ معیشت نے بہت سے سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ اُن کے جواب بھی مطلوب ہیں۔ اِن ساری ضروریات کو مؤلف نے سامنے رکھا ہے۔ فاضل مؤلف کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے ادارۂ زکوٰۃ کو آج کل کے نظامِ تمدن میں نصب ہو کر کام کرنے کے قابل دکھایا ہے اور اس مقصد کے لیے ایک خاص طرح کی ترتیبِ مباحث اور موجودہ ضروریات کے مطابق مناسب زبان فراہم کی ہے۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہونا نہ صرف اردو زبان کے سرمایے میں اضافہ ہے، بلکہ ہمارے یہاں زکوٰۃ کے نظم کے قیام کی جو مساعی ہو رہی ہیں اُن میں مدد بھی ہے۔ ترجمہ کرنے والے نوجوان صاحب صلاحیت ہیں۔ اور اُن کی تحریر مناسب ہے۔

پیشِ نظر حصہ سوم ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

مجلۂ تنظیم "خواتین یونیورسٹی نمبر" ناشر: ادارۂ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ ۔ پاکستان۔ ۱۸ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور) صفحات : ۲۳۴ ۔ قیمت نامعلوم ۔

یہ ایک سلسلہ ہے مجموعہ ہائے مضامین کا جس کے تین حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا ہمارے سامنے ہے۔ اس کی ترتیب کا کام دو مدیران نے مل کر انجام دیا ہے۔ ۱۔ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی ۲۔ جناب ظفر حجازی۔

مجلہ کی اِس اشاعت خاص میں اداریے کے علاوہ پندرہ مقالات و مضامین شامل ہیں ۔ ان مقالات و مضامین کا مجموعی استدلال یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی معاشرے کی تعمیر کے لیے مخلوط تعلیم کا خاتمہ اور اس کے قدم اول کے طور پر ایک یا زیادہ خواتین یونیورسٹیوں کا قیام ضروری ہے ، دوسرے یہ کہ اسلامی احکام و اقدار کے رُو سے مخلوط معاشرے اور مخلوط تعلیم کا سلسلہ درست نہیں ہے ، تیسرے یہ کہ بین الاقوامی خصوصاً مغربی دنیا کے شواہد بھی مخلوط تعلیم کی مضرتوں کو واضح کرتے ہیں ۔ مقالات و مضامین کے علاوہ مختلف اوراق کی خالی جگہوں کو اہلِ علم و دانش کے اقتباسات سے مزین کیا گیا ہے۔ ملک میں بہت دیر سے چھڑے ہوئے ایک اہم مسئلے کے متعلق خاصا زوردار مواد فراہم کیا گیا ہے۔ پچھلے چند برس میں خواتین یونیورسٹیوں کے قیام کا وعدہ صدر مملکت اور اُن کے وزراء نے بار بار کیا ہے ، اب اگر بیوروکریسی اس وعدہ کی تکمیل میں رکاوٹ بنتی ہے تو کم سے کم دلائل کے لحاظ سے اس قومی مطالبہ کا وزن واضح ہو جاتا ہے۔

معیارِ علماء ازمولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ۔ ناشر: المکتبۃ القاسم ، مسلم آباد ، شالامار ٹاؤن ، لاہور ۔ ملنے کا پتہ : عمران اکیڈیمی ۔ ۳۸ بی ، اُردو بازار ، لاہور ۔ قیمت : ۱۵/- روپے

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے نام اور کام سے کون واقف نہیں ، خصوصیت سے تاریخ اسلام کے موضوع پر اُن کی خدمت بہت نمایاں ہے ۔ ہم سے پہلے کی نسلی صفوں کے ممتاز اور نمایاں افراد میں سے ایک ہیں ۔ جن کے سینے میں اسلام سے بھی محبت تھی اور ملت کا بھی درد ۔

اسی محبت و درد کے تحت مرحوم کے قلم سے یہ کتاب نکلی ۔ اس کے مباحث اچھے جذبات پر مبنی ہیں ۔ انہوں نے علماء کو اُن کا مقام اور ذمہ داریاں یاد دلانے کی کوشش کی ہے ۔ زیادہ تر

آیاتِ قرآنی سے استدلال کیا گیا ہے، حسبِ ضرورت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا بھی ذکر ہے۔ مسائل و مباحث کا پیرایۂ بیان صاف طور پر آج سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ آج کی ذہنی فضا قدرے مختلف ہے۔ مگر اصولی باتیں اب بھی باعثِ افادہ ہیں۔

انقلابِ ایران از محمد صلاح الدین صاحب ایڈیٹر روزنامہ جسارت کراچی۔ ناشر: تکبیر پبلی کیشنز ۱۰۶-بی، بلاک ۲ خالد بن ولید روڈ، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی۔ صفحات ۱۴۸۔ قیمت ۲۰/- روپے

دبیز آرٹ کارڈ کے سرورق کے ساتھ سفید کاغذ پر خوبصورت طباعت کے پیرائے میں یہ کتاب وقت کی ایک اہم کتاب ہے۔ انقلابِ ایران اس دور کا ایک ایسا بڑا واقعہ ہے جس کی مثال بعض پہلوؤں سے دور دور تک نہیں ملتی۔ اور یہ ان سارے انقلابوں سے مختلف نوعیت رکھتا ہے، جو دورِ جدید میں مختلف ممالک میں برپا ہوئے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر ایک اسلامی انقلاب ہے، جس نے ایرانی معاشرے میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ تاریخ کو ہلا دینے والے اس انقلاب کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ دنیا کے مسلمانوں، خصوصاً اسلامی تحریکات کے لیے بڑا ولولہ انگیز ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کے متعلق بہت سی ایسی چہ میگوئیاں ہیں، جن سے پیدا ہونے والے سوالات ذہنوں میں وجہ خلش ہیں۔

اس کتاب کے فاضل مؤلف کو انقلاب کے بعد دو مرتبہ ایران میں جانے کا موقع ملا۔ اس کتاب کی نوعیت محض ایک سفر نامے کی ہوتی، مگر مؤلف نے انقلاب کے مالہٗ و ماعلیہ کو سمجھنے کے لیے قلیل وقت میں آنکھوں دیکھے حالات کے تجزیے کے ساتھ ساتھ خاص خاص لوگوں سے ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے اتنے مواقع پیدا کیے کہ خاصی وسیع معلومات جمع کر لیں۔ علاوہ ازیں انقلاب سے متعلق شخصیتوں کے بیانات اور دیگر اخباری معلومات کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ مشاہدہ و غور و فکر کے ماحصل کو انہوں نے اس سوال کے جواب میں مرتب کیا کہ "کیا کھویا؟ کیا پایا" دنیا کی ہر تحریک، ہر انقلاب اور ہر قیادت کے لیے یہ سوال اہم ترین سوال ہوتا ہے اور اس کے جواب میں اگر "بیلنس شیٹ" صحیح معلومات اور اخلاص و دیانت سے بے لاگ طور پر مرتب کر لی جائے تو امید افزا کامیابیاں اور پریشان کن مسائل دونوں سامنے آجاتے ہیں اور گاڑی چلانے والے

ماننے گاڑی کے رُخ اور رفتار کو درست کر سکتے ہیں۔
یہ کام محمد صلاح الدین صاحب نے ایران اور عالمِ اسلام کی سچی خیر خواہی سے انجام دیا ہے۔ اور یہ انقلابِ ایران اور اُس کی کامیابیوں کو پوری طرح سراہا ہے، مگر ساتھ کے ساتھ ان مشکلات اور پیچیدگیوں کا حساب بھی مرتب کر دیا ہے جو انقلاب کے سامنے موجود ہیں۔ محمد صلاح الدین صاحب کا اصل جذبہ یہ ہے کہ بروقت ان مشکلات اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کی فکر کی جائے۔ وہ ان چیزوں کو بیان کر کے خوش نہیں ہیں جیسے کوئی مخالف خوش ہو سکتا ہے۔ وہ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے ایک بھائی دوسرے بھائی سے اس کی بھلائی کے لیے بات کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب ایران کی سچی اور مکمل کامیابی کے ہم سب خواہاں ہیں، کیونکہ خدانخواستہ اگر ذراسی ناخوشگوار بات بھی کبھی سامنے آئے تو وہ ہم سب پر اثر انداز ہوتی ہے، یعنی پورے عالمِ اسلام پر۔
میری خواہش ہے کہ نہ صرف پاکستان کے مختلف الخیال قارئین اور ایران کے پاسدارانِ انقلاب اور شہری بلکہ سربراہانِ انقلاب اس تجزیہ کا مطالعہ محبت سے کریں اور اُن ممکنہ خطرات کے سدِ باب کی فکر کی جانی چاہیے جن کا احساس مؤلف نے کیا ہے۔

سرسید کی کہانی اُن کی اپنی زبانی راوی الطاف حسین حالی۔ مؤلف: ضیاء الدین لاہوری۔ ناشر: ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان۔ کراچی۔ کتاب ملنے کے چار پتوں میں سے ایک: مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ۔ ۳۲ لے شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ مجلد ۱۰۹ صفحات۔ قیمت ۱۵/ روپے

اس مختصر کتاب میں سرسید کی شخصیت، اُن کے دینی افکار، ان کی تعلیمی جدوجہد اور انگریزی حکومت کے متعلق اُن کے نقطۂ نظر کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔ زیادہ تر مواد مولانا الطاف حسین حالی کی حیاتِ جاوید سے اخذ کردہ ہے۔ ترتیب نئی ہے اور مؤلف نے خود کچھ بحثیں اٹھائی ہیں۔
میرے دیرینہ نقطۂ نظر کے مطابق سرسید ہماری قوم کے دورِ شکست کے ذہنی قائد ہیں۔ انہوں نے شکست کی حقیقت کے اعتراف کو نقطۂ آغاز بنایا۔ دورِ شکست کی قیادت کے لحاظ سے ہم انہیں زیادہ سے زیادہ الاؤنس دینا چاہتے ہیں۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے بعد کے

معاشرے پر ایسے بُرے اثرات پڑے کہ اُن کا نوٹس لیے بغیر چارہ نہیں:

ایک یہ کہ انگریزوں اور اہلِ مغرب کی فکر و دانش، اُن کی معاشرت اور اُن کی ثقافت کے لیے ہمارے ہاں مرعوبیت تیزی سے پھیلی اور وہ طبقہ پیدا ہوا جو "دیسی انگریز" کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری یہ کہ سرسید کی تحریروں سے دینی اعتقادات، اُمورِ غیب، تاریخِ انبیاء، معجزات اور جہاد وغیرہ کے متعلق مسلمانوں میں ایک انحرافی نقطۂ نظر فروغ پانے لگا۔ جس کی انتہا اب بعض طبقوں کو الحاد اور سیکولرازم تک لے آئی ہے۔

مؤلفِ کتاب کا ذہن بڑا صحت مندانہ ہے کہ انھوں نے روشِ عام سے ہٹ کر سرسید کی متذکرہ دونوں کمزوریوں پر اپنے انداز میں تنقیدی گرفت کی ہے۔

اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم | از جناب محمد یوسف لدھیانوی۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔ صفحات: ۲۴۰ ہدیہ بلا جلد ۱۶/- روپے

رسالہ بینات کا یہ خاص نمبر جو عنوانِ متذکرہ کا حصہ دوم ہے، مئی ۱۹۸۲ء کا شمارہ ہے۔ اس میں ایک طویل استفتاء کے جواب میں فاتحہ خلف الامام، آمین، رفع یدین، ترجیع اذان، افرادِ اقامت، تکبیراتِ عیدین، سجدۂ سہو، مسائلِ وتر، نمازِ جنازہ اور جمعہ فی القریٰ جیسے مسائل حنفی مسلک کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔

مگر جہاں اس خاص نمبر میں زورِ استدلال سے حنفی مسلک کو صحیح مسلکِ اعتدال ثابت کیا گیا ہے وہاں پورا زور اس بات پر بھی صرف کیا گیا ہے کہ اس طرح کے مسائل کا اختلاف چونکہ احادیث کی صحت و عدمِ صحت، اُن سے طریقِ اخذِ ہدایت و استنباطِ مسائل، اور ان کے ناسخ منسوخ ہونے سے ہے اور چونکہ صدرِ اول سے بعض اُمور میں اختلاف موجود ہے یا سنت ہی میں ایک سے زائد طریقوں پر چلنے کی گنجائش موجود ہے۔ اس وجہ سے ان مسائل میں تشدد و تفریق روا نہیں۔ جو شخص کسی دوسرے فقہی مدرسۂ فکر سے متعلق ہے اور کوئی دوسرا مسلک سنت سمجھ کر اختیار کرتا ہے وہ بھی برحق ہے۔ اس نقطۂ نظر

کے حق میں ص ۱۳ کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو:

" اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کے مطابق فاتحہ مقتدی کے ذمہ بھی فرض ہے اور اس کے بغیر ـــــ اس کی نماز نہیں ہوتی تو بلاشبہ آپ کو اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے، لیکن آپ کا یہ اجتہاد دوسروں پر حجت نہیں ہو سکتا۔"

بینات کا یہ نمبر اس قابل ہے کہ اسے پڑھا جائے، نیز جس نقطہ نظر کو اس میں پیش کیا گیا ہے، آسے تقاریر اور گفتگوؤں اور بحثوں میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ بلکہ کاش کہ ایسا ممکن ہوتا کہ مختلف مسلکوں کے علماء ایک جگہ جمع ہو کر کانفرنس کرتے اور ایسے تمام کلامی اور فقہی مسائل کی نشاندہی کر دیتے کہ جن میں ہر کوئی اپنے اپنے مطالعہ و تحقیق کے مطابق کسی مسلک پر چل سکتا ہے اور ان امور میں تکفیر و تفسیق اور تفرقہ انگیزی کی حرکات نہیں کی جائیں گی، نہ مسجدیں الگ کی جائیں گی اور نہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کو ناجائز قرار دیا جائے گا۔

آج جبکہ الحاد اور لادینیت اور اخلاقی زوال کا ایک طوفان اُمڈ رہا ہے۔ ان فروعی مسائل پر لڑنے کے بجائے اصل ایمانیات پر تمام گروہوں کو متفق ہو کر ساری لڑائی طاغوتی نظریوں اور تحریکوں کے خلاف لڑنی چاہیے۔

(بقیہ سیکولرازم)

نظریہ ہے جس کی بنیاد افادیت پسندی، مادیت پسندی اور نظریاتی الحاد پر ہے، اس کی بنا پر ریاست اُسے تمام عوامی اداروں پر نافذ کرتی ہے، ان میں سکول بھی شامل ہیں (۳۰ دسمبر ۱۹۵۹ء) چرچ کے اس رویے کو ویٹیکن نمبر ۲ کے ان اعلانات سے مزید تقویت حاصل ہوئی جن میں ارضی حقائق کی مکمل خودمختاری کو تسلیم کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں عیسائیوں کو اپنی پسند کا سیاسی نظام اختیار کرنے کی آزادی مل گئی۔ گویا ریاستی ڈھانچہ کی دونوں انتہاؤں کے باہر رہ کر چرچ اپنی سرپرستی کو باقی رکھنے کا دعویٰ کر رہا تھا، حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو عملی طور پر چرچ نے ریاست اور مذہب کی علیحدگی کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور یہی حکومت چاہتی تھی۔

(بقیہ اشارات) درمیان محبت و اخوت کے سچے جذبات کام کرنے لگیں۔

تب بنے گی وہ صف جسے بنیان مرصوص کہا گیا ہے۔

ہزار ذلتوں اور اذیتوں سے گزرتے ہوئے اب ہمارے حکمرانوں اور علماء اور دانش وروں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے کہ اسلام ہم سے جہاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور جہاد کے لیے اس سچے اتحاد کا طلب گار ہے جو مخلصانہ محبت و احترام پر قائم ہو۔

جہاد کی بات جب بھی طے کی جائے تو اسے سرسری نعرے کی حیثیت میں نہ لیا جائے بلکہ پورا منصوبہ بنایا جائے کہ مجموعی طور پر کتنی قوت کی ضرورت ہے اور ہر بڑے اور اہم ملک کو کس درجہ فوجی تیاری کر رکھنی چاہیے ، مسلمان ممالک ایک جہاد فنڈ قائم کریں اور اس میں مالدار ریاستیں اربوں ڈالر کے حساب سے چندہ جمع کرائیں ، پھر یہ سوچا جائے کہ فوری طور پر کون ملک کہاں کہاں سے کن طریقوں سے اپنی ضرورت کا اسلحہ حاصل کر سکتا ہے اور کن کن سامانوں کی تیاری کے لیے کس کس ملک میں کارخانے قائم کیے جائیں ، ملٹری سائنس اکیڈیمی اور اس کے ساتھ لیبارٹری کی ضرورت ہر ملک کو بھی ہے اور ایسا ایک مرکزی انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ ڈپلومیٹک اور پروپیگنڈا سرگرمیوں کے لیے خاص کالج یا اکیڈیمیاں کھول جانی چاہئیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلم حکمرانوں کو احیائے اسلام کا ایک دس بارہ نکاتی منشور بنانا چاہیے جس کے مطابق وہ رضا کارانہ طور پر اپنے اپنے ملک میں اصلاحات کریں اور حکومت اور عوام کے درمیان فاصلوں کو کم کریں۔

یہ اہتمام اگر نہ ہو تو محض کانفرنسیں اور ان میں فصیح و بلیغ تقریریں مسئلے کا حل نہیں ہیں۔

ضروری اطلاع

نیا پتہ

نعیم صدیقی — ایڈیٹر سیارہ

مکان نمبر ۱۱ بی - گلی نمبر ۱۲ - آصف بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن - لاہور

صبح سے دوپہر تک

ادارۂ معارف اسلامی

منصورہ - ملتان روڈ - لاہور

ٹیلیفون نمبر —— ۳۳ — ۳۲ ۴۰۰۰

۹۵ — ۹۱۰۴

تحریکِ اسلامی کے مراحل

از : سیّد اسعد گیلانی

- اسلامی تحریکوں کی قوت کا سرچشمہ کیا ہوتا ہے۔
- تحریکوں میں انفرادی اور اجتماعی امراض کون سے پیدا ہوسکتے ہیں
- تحریکی امراض سے بچنے کی تدابیر کیا ہوتی ہیں
- دعوت کا نورِ فہم کی روشنی اور جذبے کی توانائی کیونکر حاصل ہوسکتی ہے
- تحریک کا قافلہ سخت جان منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے کن کن مراحل سے گزرتا ہے۔
- دورِ حاضر میں اسلامی تحریکوں کے لیے کامیابی کا راستہ کون سا ہے
- فکر کی روشنی اور عمل کی بیداری کیونکر پیدا ہوسکتی ہے۔

اسی نوعیت کے تربیتی موضوعات اس کتاب میں زیرِ بحث ہیں

تحریکی کارکنوں کیلئے تربیت اخلاق و کردار کی بہترین گائیڈ بک

ضخامت : ۱۶۰ صفحات ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ، قیمت -/۱۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

علماءِ دین! — علماءِ طب — بنیئے!!

اور

ایک باعزت، موثر اور مفید — "ذریعہ معاش" جو

دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ

بھی ہے —— اس سے بہرہ ور ہو جائیے!

الحمد للہ

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم

کر لیا گیا ہے —— اور

جامعہ طبیہ اسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور ناظرہ یا موقوف علیہ سے فارغ ذہین طلبہ — کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں بلا تاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف — ۲۷۵ — جناح کالونی فیصل آباد